منورما

ایک

بنارس میں کبیر چورا ہے کے قریب منشی بجر دھر کا مکان ہے۔ آپ ہیں تو راجپوت، پر آپ اپنے کو منشی کہتے اور لکھتے ہیں۔ ''منشی'' کے لقب سے آپ کو بڑی محبت ہے۔ آپ کئی سال سے پنشن پاتے ہیں۔ بہت چھوٹے عہدے سے ترقی کرتے کرتے بالآخر آپ تحصیلداری کے منصب جلیل پر فائز ہوئے۔ اگر چہ آپ اس عہدے پر تین مہینے سے زیادہ نہ رہے اور اتنے دن بھی محض قائم مقام رہے، پر آپ اپنے آپ کو سابق تحصیلدار لکھتے تھے اور محلے والے بھی انہیں خوش کرنے کو تحصیلدار صاحب کہتے تھے۔ اعزاز پا کر آپ خوشی سے اکڑ جاتے تھے، لیکن پنشن تو پچیس ہی روپیہ ملتی تھی۔ اس لیے تحصیلدار صاحب کو بازار ہاٹ خود ہی کرنا پڑتا تھا۔ گھر میں ان کے علاوہ تین آدمی اور تھے۔ لڑکا، لڑکی اور بیوی۔ لڑکے کا نام چکر دھر تھا۔ وہ اتنا ذہین تھا کہ باپ کے پنشن کے زمانے میں گھر سے کسی قسم کی مدد نہ مل سکنے کے باوجود محض اپنی جاں فشانی سے ایم اے پاس کر چکا تھا۔ منشی جی نے پہلے ہی سے سفارشیں پہچانی شروع کی تھیں۔ درباداری کے فن میں ماہر تھے۔ حکام کو سلام کرنے کا انہیں مرض تھا۔ حاکموں نے ان کی کارگزاری کے جو پروانے دیئے تھے، وہ ان کا سرمایۂ حیات تھے۔ انہیں وہ بڑے غرور سے دوسروں کو دکھایا کرتے تھے۔ نئے حاکموں سے ربط وضبط پیدا کرنے میں ان سے بڑی مدد ملتی تھی، لیکن جب امتحان کا نتیجہ نکلا اور منشی جی نے چکر دھر سے کمشنر کے یہاں چلنے کو کہا تو اس نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔

منشی جی نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔ ''کیوں۔ کیا گھر بیٹھے تمہیں نوکری مل جائے گی؟''

چکر دھر نے کچھ خفیف ہو کر جواب دیا۔ ''ملازمت کرنے کا میرا ارادہ نہیں ہے۔ میں آزاد رہنا چاہتا ہوں۔''

بجر دھر نے حیرت سے کہا۔ ''نوکری کے سوا اور کیا کرو گے؟ آزاد رہنا تھا تو ایم۔اے کیوں پاس کیا تھا؟''

''اس لیے کہ آزادی کی قیمت سمجھوں۔''

اس دن سے باپ بیٹے میں آئے دن بم چخ مچی رہتی تھی۔ منشی جی بار بار جھنجھلاتے اور اسے کام چور، منہ زور اور کوتاہ اندیش کہہ کر اپنا غصہ اتارتے تھے۔

چکر دھر باپ کا ادب کرتے تھے۔ ان کو جواب تو نہ دیتے، پر اپنی زندگی کے لیے انہوں نے جو معیار دل میں قائم کر لیا تھا اس سے نہ ہٹتے تھے۔ یہ مضحکہ خیز معلوم ہوتا کہ آدمی محض پیٹ پالنے کے لیے آدھی عمر پڑھنے میں صرف کر دے۔ علم کو ذریعۂ معاش بناتے ہوئے انہیں شرم آتی تھی۔

اسی طرح دو سال گزر گئے۔ منشی بجر دھر نے سمجھا تھا کہ جب یہ بھوت اس کے سر سے اتر جائے گا۔ شادی بیاہ کی فکر ہو گی تو آپ ہی آپ نوکری کی تلاش میں دوڑے گا، لیکن جب دو سال گزر جانے پر بھی بھوت کے اتر جانے کی کوئی علامت نظر نہ آئی تو ایک دن انہوں نے چکر دھر کو خوب پھٹکارا۔

چکر دھر اب باپ کی مرضی سے منہ نہ موڑ سکے۔ انہیں اپنے کالج میں ہی کوئی جگہ مل سکتی تھی، لیکن وہ کوئی ایسا دھندہ چاہتے تھے جس سے تھوڑی دیر روزانہ کام کر کے اپنے باپ کی مدد کر سکیں۔ حسن اتفاق سے جگدیش پور کے دیوان ٹھاکر ہری سیوک سنگھ کو اپنی لڑکی کے لیے ایک لائق اور خوش اطوار اتالیق کی ضرورت پڑی۔ چکر دھر نے یہ خدمت قبول کر لی۔

دیوان صاحب کی لڑکی کا نام منورما تھا۔ عمر تیرہ سال سے زیادہ نہ تھی، لیکن چکر دھر کو اسے پڑھاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ وہ یہی کوشش کرتے کہ ٹھاکر صاحب کی موجودگی میں اسے پڑھائیں۔ اگر کبھی ٹھاکر صاحب گھر پر نہ ہوتے تو چکر دھر کے سر پر مصیبت سی آ جاتی تھی۔

ایک روز ایسا ہی موقع پیش آیا۔ چکر دھر کرسی پر تو بیٹھے، پر منورما کی طرف نہ تاک کر دروازہ کی طرف تاک رہے تھے۔ منورما بالمیکی رامائن پڑھ رہی تھی۔ اس کے دل میں سیتا کے بن باس کے متعلق ایک سوال پیدا ہوا تھا اور اس کا جواب چاہتی تھی۔ چکر دھر نے پوچھا۔ ''چپ کیوں بیٹھی ہو۔ آج کا سبق کیوں نہیں پڑھتیں؟''

منورما بولی۔ ''میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں۔ رام چندر نے سیتا جی کو گھر سے نکال دیا تو وہ چلی کیوں گئیں؟''

چکر دھر نے پوچھا۔ ''اور کیا کرتیں؟''

''وہ جانے سے انکار کر سکتی تھیں۔ راج پر ان کا بھی تو حق تھا؟ پھر وہ بے گناہ تھیں۔''

''ہمارے یہاں شوہر کا حکم ماننا عورت کا فرض مانا گیا ہے۔''

''یہ تو میں جانتی ہوں کہ شوہر کا حکم ماننا بیوی کا فرض ہے، لیکن کیا ہر حالت میں؟ جب رام چندر نے سیتا جی کی آزمائش کر لی تھی اور دل میں انہیں پاک سمجھتے تھے تو محض بدنامی سے بچنے کے لیے انہیں نکال دینا کہاں کا انصاف تھا؟''

چکر دھر بڑے خلجان میں پڑے۔ ان کے دل میں خود یہی اعتراض پیدا ہوا تھا اور اس کا اب تک کوئی قابل اطمینان جواب نہ ملا تھا۔ بغلیں جھانکنے لگے۔

منورما نے انہیں خاموش دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا آپ بھی انہیں گھر سے نکال دیتے؟''

''نہیں۔ میں تو شاید نہ نکالتا۔''

''آپ بدنامی کی ذرا بھی پروا نہ کرتے؟''

''نہیں۔ میں جھوٹی بدنامی کی پروا نہ کرتا۔''

منورما کی آنکھیں فاتحانہ مسرت سے چمک اٹھیں۔ بولی۔ ''یہی بات میرے دل میں بھی تھی۔''

اس دن سے منورما کی طبیعت پڑھنے کی طرف کچھ زیادہ مائل ہوگئی۔ پہلے کی طرح حیلے بہانے نہ کرتی۔ جب چکر دھر کے آنے کا وقت ہوتا تو وہ پہلے سے ہی آ بیٹھتی اور ان

کا انتظار کرتی۔ اب اسے ان سے اپنے دلی خیالات ظاہر کرنے میں تامل نہ ہوتا تھا۔

ٹھاکر ہری سیوک سنگھ کی عادت تھی کہ پہلے دو چار مہینوں تک تو نوکروں کو وقت پر تنخواہ دے دیتے، پر جیوں جیوں نوکر پرانا ہوتا جاتا وہ اس سے بے پروا ہوتے جاتے۔ چکر دھر کو بھی ادھر چار مہینوں سے کچھ نہ ملا تھا۔ ٹھاکر صاحب بلا مانگے دیتے تھے اور نہ چکر دھر لحاظ کے مارے مانگتے تھے۔ ادھر گھر میں روز تکرار ہوتی تھی۔ آخر ایک دن چکر دھر نے مجبور ہو کر ایک رقعہ لکھا۔ مگر دیوان صاحب نے رقعہ لوٹا دیا۔ بے ضرورت خط و کتابت کرنے کی انہیں فرصت نہ تھی۔ بولے۔ ''انہیں جو کچھ کہنا ہو خود آ کر کہیں۔'' چکر دھر شرماتے ہوئے گئے اور ایک لمبی تمہید کے بعد روپے مانگے۔ ٹھاکر صاحب ہنس کر بولے۔

''واہ بھئی بابو جی واہ! آپ بھی ایک ہی بے فکرے ہیں۔ چار مہینہ سے تنخواہ نہ ملی اور آپ خاموش بیٹھے رہے۔ آپ کو مہینے مہینے اپنی تنخواہ لے لینی چاہیے تھی۔ سوچیے مجھے یک مشت دینے میں کتنا تردد ہوگا۔ خیر جائیے۔ دس پانچ دن میں مل جائے گی۔''

چکر دھر کچھ نہ بولے۔ لوٹے تو چہرے پر مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ منورما نے ان کا رقعہ دیوان صاحب کے پاس لے جاتے ہوئے راستہ میں پڑھ لیا تھا۔ انہیں اداس دیکھ کر پوچھا۔ ''دادا جی آپ کو روپے نہیں دیئے؟''

چکر دھر اس کے روبرو روپے پیسے کا ذکر نہ کرنا چاہتے تھے۔ ان کا منہ لال ہو گیا۔ بولے۔ ''مل جائیں گے۔''

''آپ کو 120 چاہئیں نا؟'' منورما نے سوال کیا۔

''اس وقت کوئی ایسی ضرورت نہیں۔'' چکر دھر نے جواب دیا۔

''ضرورت نہ ہوتی۔ تو آپ مانگتے ہی کیوں؟ دیکھیے میں جا کر.....''

چکر دھر نے روک کر کہا۔ ''نہیں کوئی ضرورت نہیں۔''

منورما نے نہ مانا۔ فوراً گھر میں گئی اور پورے روپے لا کر میز پر رکھ دیئے۔

وہ تو پڑھنے بیٹھ گئی لیکن چکر دھر کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ روپے لوں یا نہ لوں۔ انہوں

نے فیصلہ کیا۔ لینا مناسب نہیں۔ سبق ختم ہو چکنے پر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور بغیر روپے لیے باہر نکل آئے۔ منورما روپے لیے ہوئے پیچھے برآمدے تک آئی۔ بار بار کہتی تھی۔ ''اسے لیتے جایئے۔'' پر چکر دھر نے ایک نہ سنی اور جلدی سے باہر نکل گئے۔

دو

چکر دھر گھر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ دروازے پر منشی جی کے ساتھ ایک نئے مہمان بیٹھے ہیں۔ نائی کھڑا پنکھا جھل رہا ہے۔ چکر دھر کی روح فنا ہو گئی۔ اندازہ سے تاڑ گئے کہ حضرت ور کی تلاش میں آئے ہیں۔ تصدیق کرنے کے لیے گھر میں جا کر ماں سے پوچھا تو اندازہ درست نکلا۔ بولے۔ ''دادا جی نے ان سے کیا کہا؟''

نرملا نے مسکرا کر کہا۔ ''نانی کیوں مر گئی۔ کیا عمر بھر کنوارے رہو گے۔ صاف کپڑے پہن کر ذرا دیر کے لیے باہر جا بیٹھو۔ بہت دیر سے تمہارا انتظار ہو رہا تھا۔''

''یہ ہیں کون؟''

''آگرے کے کوئی وکیل ہیں منشی جسودانندن۔''

چکر دھر نے دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں تو گھومنے جا رہا ہوں۔ جب یہ یم دوت چلا جائے گا تو آ جاؤں گا۔''

''واہ رے شرمیلے۔ تیرے جیسا لڑکا تو دیکھا ہی نہیں۔ آ ذرا سر میں تیل ڈال دوں، بال نہ جانے کیسے بکھرے ہوئے ہیں۔ صاف کپڑے پہن کر ذرا دیر کے لیے باہر جا کر بیٹھ۔''

اتنے میں منشی جی نے پکارا۔ ''ننھے کیا کر رہے ہو؟ ذرا یہاں تو آؤ۔'' چکر دھر کے رہے سہے حواس بھی غائب ہو گئے۔ ماں سے بولے۔ ''میں جاتا تو ہوں لیکن کہے دیتا ہوں۔ میں یہ جوا گلے میں نہ ڈالوں گا۔'' اور دبے پاؤں باہر جا کر کھڑے ہو گئے۔ جسودانندن نے اٹھ کر انہیں چھاتی سے لگا لیا اور کرسی پر بٹھاتے ہوئے بولے۔ ''اب کی 'سرسوتی' میں آپ کا مضمون دیکھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ اس مسئلہ پر ایسی فاضلانہ تحریر میری نظر سے

نہیں گزری۔''

وکیل صاحب کے بزرگانہ اخلاق اور قدردانی نے چکر دھر کو رام کر لیا۔ کچھ جواب دینا ہی چاہتے تھے کہ بجر دھر بول اٹھے۔ ''تم نے بہت دیر لگا دی۔ راجہ صاحب سے کچھ بات چیت ہونے لگی تھی۔''

یہ کہتے کہتے منشی جی گھر میں چلے گئے تو جسو دانندن نے پوچھا۔ ''اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟''

چکر دھر نے سر جھکا کر کہا۔ ''ابھی تو کچھ فیصلہ نہیں کیا، ہاں ارادہ ہے کہ کچھ دن آزادہ کر قوم کی خدمت کروں۔''

جسو دانندن نے کہا۔ ''اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے؟ آپ جتنی خوبی سے ''سرسوتی'' کو چلا رہے ہیں اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ آپ کے انہیں اوصاف نے مجھے گرویدہ کر لیا ہے۔''

چکر دھر نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں ابھی خانہ داری کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میرا خیال ہے کہ خانہ داری میں پھنس کر قومی کام کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔''

جسو دانندن نے ملائمت سے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ اگر بیوی اور شوہر کے خیالات میں اتفاق ہو تو عورت مرد کے کاموں میں حائل ہونے کے بدلے معاون ہو سکتی ہے۔ میری لڑکی کے خیالات بالکل آپ سے ملتے ہیں اور مجھے پورا یقین ہے کہ آپ دونوں ایک ساتھ رہ کر سکھی رہیں گے۔ خدمت کے کاموں میں وہ آپ سے ایک قدم ہمیشہ آگے رہے گی۔ انگریزی، ہندی، اردو اور سنسکرت پڑھی ہوئی ہے اور گھر کے کاموں میں بھی ماہر ہے۔ رہی شکل صورت تو میں آپ کے لیے اس کی تصویر لیتا آیا ہوں۔''

یہ کہہ کر جسو دانندن ایک تصویر چکر دھر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

''میں تو اسے معیوب نہیں سمجھتا بلکہ میرا تو خیال ہے کہ عورت مرد کو تبادلۂ خیالات کا موقع ملنا چاہیئے۔''

چکر دھر کے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے کہ تصویر کو کیونکر غور سے دیکھوں۔ وہاں دیکھتے شرم آتی تھی۔ مہمان کو تنہا چھوڑ کر گھر میں جاتے نہ بنتا تھا۔ آخر نہ رہا گیا۔ پان کی طشتری اور تصویر لیتے ہوئے گھر میں چلے گئے۔ اپنے کمرے میں آ کر تصویر کو آنکھوں سے پینے لگے۔ انہیں ایسا معلوم ہوا گویا تصویر نے شرم سے آنکھیں نیچی کر لی ہیں۔ گویا ان سے کچھ کہہ رہی ہے۔ تصویر ہاتھ میں لیے ہوئے چکر دھر آنے والی زندگی کے میٹھے خواب دیکھنے لگے۔ یہ دھیان بھی نہ رہا کہ منشی جسوداننن باہر اکیلے بیٹھے ہیں۔

یکا یک طبلے کی تھاپ نے انہیں بیدار کیا۔ منشی بجر دھر کو گانے بجانے کا شوق تھا۔ گلے میں لوچ تو نہ تھی مگر تال سر سے واقف تھے۔ چکر دھر باہر آئے تو منشی جی نے دھرپد کی ایک تان چھیڑ دی تھی۔ پنچم سر تھا۔ آواز پھٹی ہوئی تھی۔ سانس اکھڑ جاتی تھی۔ بار بار کھانس کر گلا صاف کرتے تھے۔ لوچ کا نام نہ تھا۔ کبھی کبھی بے سرے بھی ہو جاتے تھے، مگر سازندے واہ، واہ کی دھوم مچائے ہوئے تھے۔

آدھی رات کے قریب گانا ختم ہوا۔ کھانا کھانے کے بعد جب دونوں آدمی باہر آئے تو بجر دھر نے پوچھا۔

''آپ سے کچھ بات چیت ہوئی؟''

''جی ہاں ہوئی لیکن نہیں کھلے۔'' جسوداننن نے جواب دیا۔

''شادی کے نام سے چڑتا ہے۔'' بجر دھر نے کہا۔

''اب شاید راضی ہو جائیں۔'' جسوداننن نے یقین دلایا۔

صبح کو جسوداننن نے چکر دھر سے سوال کیا۔ ''کیوں بیٹا ایک دن کے لیے میرے ساتھ آگرے چلو گے؟''

چکر دھر نے کہا۔ ''میں تو ابھی اس جنجال میں پھنسنا نہیں چاہتا۔''

جسوداننن نے بزرگانہ انداز سے کہا۔ ''میں جنجال میں نہیں پھنساتا، تمہیں ایسا سچا رفیق، ایسا سچا مشیر دے رہا ہوں جو تمہارے مقصد حیات کو پورا کرنا اپنا خاص فرض سمجھے

گی۔ میں اپنی غرض سے ایسا نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں خود آگرے کی ہندو سبھا کا سیکرٹری ہوں اور قومی کام کی اہمیت کو سمجھتا ہوں۔ اگر میں سمجھتا کہ یہ شادی آپ کے کام میں رخنہ انداز ہوگی تو ہرگز اصرار نہ کرتا۔''

چکر دھر بڑے شش و پنج میں پڑے۔ اصولاً تو وہ شادی کے معاملے میں عورتوں کو پوری آزادی دینے کے حق میں تھے کہ کہیں اس حسینہ نے من پھیکا کرلیا تو مفت میں خفت ہوگی۔ بہت حیص بیص کے بعد بولے۔ ''میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ میں ابھی.....''

جسودانندن نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ ''ان حیلوں سے آپ کا دامن چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ میں آپ کے دل کی کیفیت کو سمجھ رہا ہوں۔ مگر اطمینان رکھیے اہلیا ان چنچل لڑکیوں میں نہیں ہے جس کے سامنے جا کر آپ کو شرمانا پڑے۔ آپ اس کا بھولا پن دیکھ کر خوش ہوں گے۔ میں تو اسی کا لالچ دے کر دو چار دن کے لیے ٹھہرا سکتا ہوں۔ پر شاید آپ کے گھر کے لوگ اسے پسند نہ کریں گے۔''

چکر دھر نے سوچا۔ اگر میں نے اور زیادہ ٹال مٹول کی تو کہیں یہ حضرت سچ مچ ہی اہلیا کو یہاں نہ پہنچا دیں۔ بولے۔ ''جی نہیں۔ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ میں ہی چلا چلوں گا۔''

نرملا تو خوشی سے راضی ہوگئی۔ ہاں منشی بجر دھر کو کچھ تامل ہوا۔ مگر جسودانندن کے اصرار اور موٹی رقم ملنے کی امید نے انہیں نیم راضی کرلیا۔ اب صرف ٹھاکر ہری سیوک سنگھ سے رخصت لینی تھی۔ چکر دھر یوں تو تیسرے پہر جایا کرتے تھے، پر آج نو بجے ہی جا پہنچے۔

جب چکر دھر پہنچے تو ٹھاکر صاحب اپنی معشوقہ لونگی سے کچھ باتیں کر رہے تھے۔ منورما کی ماں اسے گود میں ہی چھوڑ کر مر چکی تھی۔ لونگی اس وقت لونڈی تھی۔ پر اس نے گھر کو اس خوبی سے سنبھالا کہ ٹھاکر اس پر ریجھ گئے اور گھر کے ساتھ اپنا دل بھی اسے سونپ دیا۔ لونگی درد شناس، صابر، ہنس مکھ اور متحمل مزاج عورت تھی، جو نوکروں کو تنخواہ نہ ملنے پر بھی غلام

بنائے رکھتی تھی۔ غصہ، حسد، غرور اس سے چھو بھی نہ گیا تھا۔ ٹھاکر صاحب اس پر کبھی کبھی بگڑ جاتے تھے۔ دو ایک بار مارا بھی تھا۔ پر اس کے ماتھے پر بل نہ آتا تھا۔ ٹھاکر صاحب کا سر بھی دکھے تو وہ بے تاب ہو جاتی تھی۔

اس وقت دونوں میں کوئی بحث چھڑی ہوئی تھی کہ منورما نے آ کر کہا۔ ''بابو جی آئے ہیں۔ آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔''

ٹھاکر صاحب کی بھویں تن گئیں، بولے۔ ''کہنا کیا چاہتے ہوں گے۔ روپے مانگنے آئے ہوں گے۔ اچھا جا کر کہہ دو۔ آتے ہیں بیٹھیے۔''

لونگی نے سفارش کی۔ ''ان کے روپے دے کیوں نہیں دیتے۔ بیچارے شرم کے مارے مانگتے نہیں۔ کئی مہینے تو چڑھ گئے۔''

یہ کہہ کر لونگی گئی اور روپے لا کر ٹھاکر صاحب سے بولی۔ ''لو دے آؤ۔ سن لینا شاید کچھ کہنا چاہتے ہوں۔''

ٹھاکر صاحب نے جھنجھلا کر روپے اٹھا لیے اور باہر چلے لیکن راستے میں غصہ فرو ہو گیا۔ چکر دھر کے قریب پہنچے تو چہرہ پر شکن تک نہ تھی۔

چکر دھر نے ٹھاکر صاحب کے آنے پر انہیں آداب کیا اور بولے۔ ''آپ کو ایک تکلیف دینے آیا ہوں۔''

''نہیں نہیں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ یہ لیجیے آپ کے روپے۔''

''میں اس وقت دوسرے ہی کام سے آیا ہوں۔ مجھے ایک کام سے آگرے جانا ہے۔ شاید دو تین دن لگ جائیں۔ آپ کی اجازت چاہتا ہوں۔''

ٹھاکر صاحب ان کی فرمانبرداری پر خوش ہو کر بولے۔ ''ہاں ہاں شوق سے جائیے، مجھ سے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔''

جب ٹھاکر صاحب چلے گئے تو منورما نے پوچھا۔ ''آپ آگرے کس لیے جا رہے ہیں؟''

''ایک ضرورت سے جا رہا ہوں۔'' چکر دھر نے جواب دیا۔

''کوئی بیمار ہے کیا؟''

''نہیں بیمار تو کوئی نہیں۔''

''پھر کیا کام ہے۔ بتلاتے کیوں نہیں؟ جب تک نہ بتلائیے گا۔ میں جانے نہ دوں گی۔''

''لوٹ کر بتا دوں گا۔ تم کتاب دیکھتی رہنا۔''

''جی نہیں میں یہ نہیں مانتی۔ ابھی بتلائیے۔ آپ مجھ سے بنا بتائے چلے گئے تو میں کچھ نہ پڑھوں گی۔''

''یہ بڑی ٹیڑھی شرط ہے۔ بتلا ہی دوں۔ اچھا ہنسنا مت۔ تم ذرا بھی مسکرائیں اور میں چلا۔''

''میں دونوں ہاتھوں سے منہ بند کیے لیتی ہوں۔''

چکر دھر نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''میری شادی کی کچھ بات چیت ہے۔'' یہ کہہ کر چکر دھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ منورما بھی ان کے ساتھ ساتھ آئی۔ جب وہ برآمدے سے نیچے اترے تو وہ اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور بار بار رونا آتا تھا۔ گویا چکر دھر سے ہمیشہ کے لیے جدائی ہو رہی ہے۔

تین

شام کے وقت جب ریل گاڑی بنارس سے چلی تو جسو دانندن نے چکر دھر سے کہا۔ ''میں نے اہلیا کے متعلق آپ سے کئی باتیں جھوٹی کہی ہیں۔ دراصل وہ میری لڑکی نہیں ہے۔ اس کے ماں باپ کا ہمیں کچھ بھی پتہ نہیں۔''

چکر دھر نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ''تو وہ آپ کے یہاں کیسے آئی۔''

جسو دانندن نے کہا۔ ''لمبی داستان ہے۔ پندرہ سال ہوئے۔ ایک بار سورج گرہن لگا تھا۔ آگرے میں ہماری سیوا سمتی تھی۔ ہم لوگ جاتریوں کی خدمت کے لیے پریاگ

آئے تھے۔ اسی میلے میں ہمیں یہ لڑکی ملی۔ پیدائش سے نہ ہو، پر دھرم سے وہ میری لڑکی ہے۔ میں نے سارا ماجرہ آپ سے کہہ دیا۔ اب آپ کو اختیار ہے جو فیصلہ چاہیں کریں۔ آپ کے مضامین رسالوں میں دیکھ چکا ہوں۔ آپ کی جانب سے تو کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ رہے آپ کے والد صاحب انہیں راضی کر لینے کا میرا ذمہ۔''

چکر دھر کے دل میں حق و باطل کا مناظرہ ہونے لگا۔ باطل نے کہا۔ ''جگ ہنسائی ہو گی۔'' حق نے کہا۔ ''اصول کو رسوائی پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔'' باطل نے فلسفہ کی آڑ لی۔ ''کیا معلوم کس کی لڑکی ہے۔ اس کے والدین کس قماش کے لوگ تھے۔ خون کا اثر کبھی زائل نہیں ہوتا۔'' من نے کہا۔ ''صحبت اور تعلیم کا اثر بھی تو اتنا ہی مضبوط ہوتا ہے۔'' آخر حق نے فتح پائی بولے۔ ''میری طرف سے آپ اطمینان رکھیں۔ میں اتنا بے غیرت نہیں ہوں۔ ماں باپ کی اطاعت لازمی ہے، پر فرض اور حق کا خون کر کے نہیں۔ فرض کے سامنے والدین کی مرضی کوئی وقعت نہیں رکھتی۔''

جسودانندن نے چکر دھر کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تم سے یہی امید تھی۔''

گاڑی آگرے پہنچی تو دن نکل آیا تھا۔ منشی جسودانندن ابھی قلیوں کو پکار ہی رہے تھے کہ ان کی نگاہ پولیس کے سپاہیوں پر پڑی۔ چاروں طرف پہرہ تھا۔ انہوں نے تعجب سے پوچھا۔ ''کیوں صاحب آج یہ سختی کیوں ہے؟''

تھانیدار نے جواب دیا۔ ''آپ لوگوں نے جو کانٹے بوئے ہیں ان کا پھل ہے۔ شہر میں فساد ہو گیا ہے۔''

اتنے میں سمتی کا ایک کارندہ دوڑتا ہوا آ پہنچا۔ جسودانندن نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

''کیوں رادھے موہن یہ کیا معاملہ ہو گیا؟''

''جس روز آپ گئے۔ اس روز کسی مولوی صاحب نے پنجاب سے آ کر مسلمانوں کے مجمع میں تقریر کی تھی۔ اس وقت سے مسلمانوں کو قربانی کی دھن سوار ہے۔ ادھر ہندوؤں کو بھی یہ ضد ہے کہ چاہے خون کی ندی بہہ جائے، قربانی نہ ہونے پائے گی۔

دونوں طرف سے تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ہم تو سمجھا کر ہار گئے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ خواجہ محمود اس جلسہ کے صدر تھے۔''

جسودانندن نے پوچھا۔ ''خواجہ محمود کچھ نہ بولے؟''

''انہی کے دروازے پر تو قربانی ہونے جا رہی ہے۔''

جسودانندن: ''خواجہ محمود کے دروازے قربانی ہوگی!! اس سے پہلے یا تو میری قربانی ہوگی یا خواجہ محمود کی۔ تانگے والے کو بلاؤ۔''

''اچھا ہو کہ آپ اس وقت یہیں رک جائیں۔''

''واہ واہ۔ شہر میں آگ لگی ہوئی ہے اور تم کہتے ہو میں یہیں رک جاؤں۔ جو دوسروں پر بیتے گی وہ مجھ پر بھی بیتے گی۔ تم لوگوں نے بڑی بھول کی۔ مجھے پہلے خبر نہ دی۔''

تینوں آدمی تانگہ میں سوار ہو کر چلے۔ سڑکوں پر سینکڑوں آدمیوں کا اژدہام تھا۔ اگرچہ کسی کے ہاتھ میں لاٹھی یا ڈنڈے نہ تھے، مگر سب کے چہرے جہاد کے نور سے سرخ ہو رہے تھے۔ جسودانندن کو دیکھتے ہی کئی آدمی ان کی طرف لپکے۔ جب انہوں نے زور سے چلا کر کہا۔ ''میں تم لوگوں سے لڑنے نہیں آیا ہوں۔ کہاں ہیں خواجہ محمود؟ ممکن ہو تو انہیں بلا دو۔'' یہ سن کر لوگ ہٹ گئے۔ ذرا دیر میں ایک لانبا سا آدمی گاڑھے کی اچکن پہنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ خواجہ محمود تھے۔

جسودانندن نے لہجہ کو نرم بناتے ہوئے کہا۔ ''کیوں خواجہ صاحب آپ کو خوب معلوم ہے کہ محلّہ میں کبھی قربانی نہیں ہوئی۔ آپ یہ نئی رسم کیوں نکال رہے ہیں؟''

خواجہ صاحب نے متانت کے ساتھ کہا۔ ''اس لیے کہ قربانی کرنا ہمارا حق ہے۔ جب تک آپ ہمارے جذبات کا لحاظ کرتے تھے ہم بھی آپ کے جذبات کا لحاظ کرتے تھے۔ جب آپ نے ہمارے جذبات کا لحاظ کرنا چھوڑ دیا تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم آپ کے جذبات کی قدر کریں۔''

جسودانندن نے پوچھا۔ ''آپ ایسی کوئی مثال دے سکتے ہیں؟''

خواجہ محمود نے جواب دیا۔ ''بیشک۔ مثلاً مسلمانوں کو شدھی کرنے کا آپ کو پورا حق حاصل ہے، لیکن کم سے کم پانچ سو برسوں سے آپ نے اس حق کا استعمال نہیں کیا۔ اب آپ لوگوں نے ایک مردہ حق کو زندہ کیا ہے۔ اگر ہم بھی آپ کی پیروی کریں تو آپ کو ناگوار نہیں ہونا چاہیے۔''

''آپ نے بھی تو تبلیغ جاری کی۔''

''ہم نے اسے مردہ کب ہونے دیا تھا؟''

''تو اس کے یہ معنی ہیں کہ کل آپ ہمارے دروازوں پر یا مندروں کے سامنے قربانی کریں اور ہم خاموش رہیں۔ آپ یہاں ہرگز قربانی نہیں کر سکتے اور اگر کی تو اس کی ذمہ داری آپ کے سر ہوگی۔''

یہ کہہ کر جسودانندن پھر تانگے پر جا بیٹھے اور تھوڑی دیر میں گھر پہنچ گئے۔ وہاں بھی ہزاروں آدمی جمع تھے۔ انہیں دیکھتے ہی ہلچل مچ گئی۔

جسودانندن تانگے سے اتر پڑے اور للکار کر بولے۔ ''بھائیو! آپ جانتے ہیں۔ اس محلے میں آج تک کبھی قربانی نہیں ہوئی۔ اگر آج یہاں قربانی کرنے دیں گے تو کون کہہ سکتا ہے کہ کل کو ہمارے مندروں کے سامنے گئوہتیا نہیں ہوگی۔''

کئی آوازیں ایک ساتھ آئیں۔ ''ہم مر مٹیں گے لیکن یہاں قربانی ہرگز نہ ہونے دیں گے۔''

ہجوم کو اس طرح مشتعل کر کے جسودانندن آگے بڑھے اور کئی آدمی، مہاویر اور سری شری رام چندر کی جے کار کرتے ہوئے ان کے پیچھے چلے۔ ادھر سے بھی ''اللہ اکبر'' کا نعرہ بلند ہوا اور مسلمانوں نے بھی ڈنڈے سنبھالے۔ قریب تھا کہ دونوں جماعتوں میں آویزش ہو جائے کہ یکا یک چکر دھر آگے بڑھ کر جسودانندن کے سامنے کھڑے ہو گئے اور عاجزی لیکن مضبوط لہجہ میں بولے۔ ''آپ اگر ادھر جانا چاہتے ہیں تو میری چھاتی پر پاؤں رکھ کر جائیے۔''

جسودانندن نے چڑھ کر کہا۔ ''ہٹ جاؤ۔ اگر ایک لمحہ کی بھی دیر ہوئی تو پھر پچھتانے کے علاوہ اور کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔''

''دوستو! یہ ضبط سے کام لینے کا موقع ہے۔'' چکردھر نے اسی لہجے میں دوبارہ کہا۔

''ضبط سے کام لینا بزدلوں کا کام ہے۔'' کئی آوازیں آئیں۔

''تو جائیے، لیکن اس گئو کر بچانے کے لیے آپ کو اپنے ایک بھائی کے خون سے ہاتھ رنگنے ہوں گے۔''

یکا یک ایک پتھر چکردھر کے سر میں آ کر لگا۔ خون کی دھار بہہ نکلی، لیکن چکردھر اپنی جگہ سے ہلے بھی نہیں۔ سر تھام کر بولے۔ ''اگر میرے خون سے آپ کے غصہ کی آگ سرد ہوتی ہے تو یہ میرے لیے خوش قسمتی کی بات ہوگی۔''

جسودانندن نے گرج کو پوچھا۔ ''یہ پتھر کون پھینک رہا ہے؟ اگر وہ اتنا ہی دلیر ہے تو کیوں نہیں سامنے آ کر اپنی دلیری دکھاتا۔ پیچھے کھڑا پتھر کیوں پھینک رہا ہے؟''

''دھرم کے غداروں کو مارنا ادھرم نہیں ہے۔'' ایک طرف سے آواز آئی۔

''جسے تم دھرم کا غدار کہہ رہے ہو وہ تم سے کہیں زیادہ سچا ہندو ہے۔'' جسودانندن نے جواب دیا۔

''سچے ہندو وہی تو ہوتے ہیں جو موقع پڑنے پر بغلیں جھانکنے لگیں اور شہر چھوڑ کر دو چار روز کے لیے کھسک جائیں۔'' وہ آواز پھر سنائی دی۔

''آپ لوگ سن رہے ہیں؟ میں سچا ہندو نہیں ہوں۔ میں موقع پڑنے پر بغلیں جھانکنے لگتا ہوں اور جان بچانے کے لیے شہر سے بھاگ جاتا ہوں۔ ایسا آدمی سمتی کا سیکرٹری بننے کے قابل نہیں۔ آپ اس آدمی کو اپنا سیکرٹری بنالیں، جسے آپ سچا ہندو سمجھتے ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے منشی جسودانندن گھر کی طرف چلے۔ کئی آدمیوں نے انہیں روکنا چاہا، لیکن انہوں نے ایک نہ مانی۔ ان کے جاتے ہی یہاں آپس میں تو تو، میں میں ہونے لگی۔

چکر دھر نے جب دیکھا کہ اس طرف سے کوئی اندیشہ نہیں ہے تو وہ لپک کر مسلم جماعت کے روبرو جا پہنچے اور بلند آواز میں بولے۔

''حضرات میں آپ لوگوں سے کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔''

''سنو۔سنو۔یہی تو ابھی ہندوؤں کے سامنے کھڑا تھا۔''ایک صاحب بولے۔

چکر دھر نے اپنی بات جاری رکھی۔''اگر گائے کی قربانی کرنا آپ اپنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں تو شوق سے کیجیے۔لیکن کیا یہ لازمی ہے کہ اسی جگہ قربانی کی جائے؟ اسلام نے ہمیشہ دوسروں کے جذبات کا احترام کیا ہے۔اگر آپ ہندو جذبات کا لحاظ کر کے کسی دوسری جگہ قربانی کر لیں تو یقیناً اسلام کے وقار میں فرق نہیں آئے گا۔''

ایک مولوی صاحب نے تیز ہو کر کہا۔''ایسی میٹھی میٹھی باتیں ہم نے بہت سنی ہیں۔ قربانی یہیں ہوگی اور ایسی وقت ہوگی۔''

خواجہ محمود بڑے غور سے چکر دھر کی باتیں سن رہے تھے۔مولوی صاحب کی بد دماغی پر ترش ہو کر بولے۔''کیا شریعت کا حکم ہے کہ قربانی یہیں ہو.....؟''

مولوی صاحب نے خواجہ محمود کی طرف بدگمان نظروں سے دیکھ کر کہا۔''شریعت کے معاملات میں علماء کے سوا کسی کو دخل دینے کا اختیار نہیں ہے۔''

خواجہ محمود نے مولوی صاحب کی طرف طنز سے دیکھتے ہوئے کہا۔''برا نہ مانیے گا مولوی صاحب۔اگر دس سپاہی آ کر یہاں کھڑے ہو جائیں تو بغلیں جھانکنے لگیے گا۔''

مولوی صاحب نے مجمع کو مخاطب کر کے کہا۔''بھائیو! آپ لوگ خواجہ صاحب کی زیادتی دیکھ رہے ہیں؟ آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ دینی معاملات میں علماء کا فیصلہ واجب ہے یا امراء کا؟''

ایک موٹے تازے دڑھیل آدمی نے کہا۔''جناب آپ بسم اللہ کیجیے۔امراء کو دین سے کوئی سروکار نہیں۔''

یہ سنتے ہی ایک آدمی بڑا سا چھرا لے کر نکل پڑا اور کئی آدمی گائے کے سینگ پکڑنے

لگے۔ گائے جواب تک چپ چاپ کھڑی تھی، چھرا دیکھتے ہی اس کی بوٹیاں کانپنے لگیں۔ یہ منظر دیکھ کر چکر دھر تلملا اٹھے۔ انہوں نے لپک کر گائے کی گردن پکڑ لی اور بولے۔

''آج آپ لوگوں کو اس گئو کے ساتھ ایک انسان کی بھی قربانی کرنی پڑے گی۔''

سب لوگ حیرانی سے چکر دھر کی طرف دیکھنے لگے۔ مولوی صاحب نے غصہ سے بل کھاتے ہوئے کہا۔

''ہٹ جاؤ، ورنہ غضب ہو جائے گا۔''

ہو جانے دیجیے۔ آج خدا کی یہی مرضی ہے کہ گائے کے ساتھ میری بھی قربانی ہو۔''

خواجہ محمود۔ ''قسم خدا کی۔ تم جیسا دلیر آدمی نہیں دیکھا۔ تم کلمہ کیوں نہیں پڑھ لیتے؟''

''میں ایک خدا کا قائل ہوں۔ وہی سارے جہان کا خالق اور مالک ہے پھر اور کس پر ایمان لاؤں۔'' چکر دھر نے خواجہ صاحب کی بات کا جواب دیا۔

''واللہ، تب تو تم سچے مسلمان ہو۔ ہمارے ساتھ کھانے پینے میں پرہیز تو نہیں کرتے؟''

''ضرور کرتا ہوں۔ اسی طرح جس طرح کسی برہمن کے ساتھ کھانے پینے سے پرہیز کرتا ہوں۔ اگر وہ پاک صاف نہ ہو۔''

خواجہ محمود نے خوش ہو کر کہا۔ ''کاش۔ تم جیسے سمجھدار تمہارے اور بھائی بھی ہوتے، مگر یہاں تو لوگ ہمیں ملیچھ سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمیں کتوں سے بھی زیادہ نجس سمجھتے ہیں۔ واللہ آپ سے مل کر دل خوش ہو گیا۔ اب کچھ امید ہو رہی ہے کہ شاید دونوں قوموں میں اتفاق ہو جائے۔ اب آپ جائیے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ قربانی نہ ہو گی۔''

خواجہ محمود نے چکر دھر کو گلے لگا کر رخصت کیا۔ ادھر اسی وقت گائے کو آزاد کر دیا گیا۔ وہ جان بچا کر بھاگی اور لوگ بھی اس نوجوان کی ہمت اور جواں مردی کی تعریف کرتے ہوئے چلے۔

چکر دھر کو آتے دیکھ کر جسودا نندن اپنے کمرے سے نکل آئے اور اسے سینے سے لگا کر

بولے۔

''بیٹا آج تمہارا ضبط اور استقلال دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔تم نے آج ہماری لاج رکھ لی۔''

انہیں کمرے میں بٹھا کر جسودانندن نے گھر میں جا کر اپنی بیوی باگیشوری سے کہا۔

''آج میرے ایک دوست کی دعوت ہے۔کھانا خوب مزے دار بنانا۔اہلیا آج تمہارا کھانا بنانے کا امتحان ہے۔''

''وہ کون آدمی تھا دادا جس نے مسلمانوں کے ہاتھوں گائے کی حفاظت کی۔'' اہلیا نے سوال کیا۔

''وہی میرے دوست تو ہیں جن کی دعوت کے لیے تم سے کہہ رہا ہوں۔یہاں سیر کرنے آئے ہیں۔''

اہلیا نے باگیشوری کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔''اماں! انہیں ذرا اندر تو بلا لو، درشن کریں گے۔''

پڑوس میں ایک ڈاکٹر رہتے تھے۔جسودانندن نے انہیں بلا کر زخم پر پٹی بندھوا دی۔ آہستہ آہستہ سارا محلّہ جمع ہو گیا۔

کھانے کے بعد جیوں ہی لوگ اٹھے، اہلیا نے کمرے کی صفائی کی۔ان کاموں سے فرصت پر کر وہ تنہائی میں بیٹھ کر پھولوں کی ایک مالا گوندھنے لگی۔دل میں سوچتی تھی کہ نہ جانے کون ہے۔کتنا بھولا ہے۔شرمانے میں تو عورتوں کو بھی مات کرتا ہے۔کھانا کھا چکے، لیکن سر نہ اٹھایا۔دیکھنے میں برہمن معلوم ہوتا ہے۔چہرہ دیکھ کر تو کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ یہ اتنے باہمت ہوں گے۔

اچانک باگیشوری نے آ کر کہا۔''بیٹی دونوں آدمی آ رہے ہیں۔ساڑھی تو بدل لو۔''

اہلیا ''اونہہ'' کر کے رہ گئی۔ہاں اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔اتنے میں جسودانندن چکردھر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔باگیشوری اور اہلیا دونوں کھڑی

ہوگئیں۔

جسودانندن نے چکردھر کو قالین پر بٹھایا اور خود کمرے سے باہر چلے گئے۔ باگیشوری پنکھا جھلنے لگی۔ لیکن اہلیا بت کی مانند کھڑی رہی۔

چکردھر نے اڑتی ہوئی نگاہوں سے اہلیا کو دیکھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ آنکھوں کی روشنی تیز ہوگئی ہو۔ گویا ان کی زندگی کا سنہرا خواب آنکھوں میں پھر گیا ہو۔

باگیشوری نے مٹھائی کی طشتری سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''کچھ جل پان کرلو بھیا۔ تم نے کھانا بھی کچھ نہیں کھایا۔ بھیا تو جیسے ویروں کو تو سوا سیر سے کم نہیں کھانا چاہیے۔ اہلیا ذرا گلاس میں پانی تو لانا۔ بھیا۔ جب تم مسلمانوں کے سامنے اکیلے کھڑے تھے تو یہ ایشور سے تمہاری جان کی خیر منا رہی تھی۔ جانے کتنی منوتیاں کر ڈالیں۔ کہاں ہے وہ مالا جو تو نے گوندھی تھی؟ اب پہناتی کیوں نہیں؟''

اہلیا نے شرماتے ہوئے کانپتے ہاتھوں سے مالا چکردھر کے گلے میں ڈال دی اور آہستہ سے پوچھا۔ ''کیا سر میں زیادہ چوٹ آئی ہے؟''

چکردھر نے جواب دیا۔ ''نہیں تو۔ بابو جی نے خواہ مخواہ پٹی بندھوادی۔''

چکردھر مٹھائی کھانے لگے۔ اتنے میں مہری نے آکر کہا۔ ''بڑی بہو جی۔ میرے لالہ کو رات سے کھانسی آرہی ہے۔ کوئی دوا دے دو۔''

باگیشوری دوا دینے چلی گئی۔ اہلیا چکردھر کے پاس اکیلی رہ گئی تو چکردھر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''میری وجہ سے آپ کو بہت تکلیف ہوئی۔ میں تو اس تحفہ کے لائق نہیں ہوں۔''

اتنے میں باگیشوری واپس آگئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بھیا تم نے آدھی مٹھائی بھی نہیں کھائی۔ کیا اسے دیکھ کر بھوک پیاس اڑ گئی۔ یہ موہنی ہے، اس سے ہوشیار رہنا۔''

''اماں۔ تم چھوٹے بڑے کسی کا بھی لحاظ نہیں کرتیں۔''

چکر دھر یہاں گھنٹہ بھر تک بیٹھے رہے۔ باگیشوری نے ان کے گھر کے تمام حالات معلوم کر لیے۔ کتنے بھائی ہیں، کتنی بہنیں ہیں، والد کیا کرتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ چار بجتے بجتے خواجہ محمود کے آنے کی خبر ملی۔ چکر دھر باہر چلے گئے، اور بھی کئی آدمی ملنے آئے تھے۔ شام تک ان لوگوں سے باتیں ہوتی رہیں۔ فیصلہ ہوا کہ ایک پنچایت بنائی جائے اور آپسی جھگڑے اسی پنچایت میں فیصل ہوا کریں۔ چکر دھر کو بھی ان لوگوں نے اس پنچایت کا ممبر بنالیا۔

رات کو جب اہلیا اور باگیشوری چھت پر لیٹیں تو باگیشوری نے پوچھا۔

''کیوں اہلیا سو گئیں کیا؟''

''نہیں اماں۔ جاگ رہی ہوں۔''

''ہاں۔ آج تجھے کیوں نیند آئے گی۔ ان سے بیاہ کرے گی؟ تیرے بابو جی تم سے ملانے کے لیے ہی انہیں کاشی سے اپنے ساتھ لائے ہیں۔ ان کے پاس اور کچھ ہو یا نہ ہو، لیکن دل ضرور ہے اور ایسا دل جو بہت کم لوگو کے حصہ میں آتا ہے۔ اگر تیری مرضی ہو تو کہہ دے اپنی ہی برادری کے ہیں۔ ایسا اچھا بر تجھے اور کون ملے گا؟''

اہلیا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''انہیں ساری باتیں معلوم ہیں۔''

''تمہارے بابو جی نے سارا ماجرہ بیان کر دیا ہے۔''

''مجھے تو یقین نہیں آتا۔''

''ٹالو مت۔ دل کی بات صاف صاف کہہ دو۔''

''تم میرے دل کا حال مجھ سے زیادہ جانتی ہو۔''

کہتے کہتے اہلیا نے ڈبڈبائی آنکھوں سے باگیشوری کو دیکھا، پر منہ سے کچھ نہ بولی۔ شکر لفظوں میں آکر اسم ہو جاتا ہے۔ اس کی حقیقی صورت وہی ہے جو آنکھوں سے باہر نکلتے ہوئے کانپتی اور لجاتی ہے۔

منشی بجر دھر ریل کے ان مسافروں میں تھے جو پہلے تو گاڑی میں کھڑے ہونے کی جگہ مانگتے ہیں۔ پھر بیٹھنے کی فکر کرنے لگتے ہیں اور آخر میں سونے کی تیاری کرنے لگتے ہیں۔

چکر دھر ایک بڑی ریاست کے دیوان کی لڑکی کو پڑھائیں اور وہ اس سنہری موقع سے فائدہ نہ اٹھائیں، یہ کیونکر ممکن تھا۔ منشی جی نے دیوان صاحب کی سلامی کرنی شروع کر دی تھی۔ ایک ذی ثروت عہدہ دار سے ربط ضبط پیدا کرنے کا ایسا نادر موقع پا کر وہ کیوں چوکنے لگے۔ لسان تھے ہی، دو چار ملاقاتوں میں ان کا سکہ جم گیا۔ دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے۔ ایک دن دیوان صاحب کے ساتھ رانی جگدیش پور کے دربار میں جا پہنچے اور ایسی لچھے دار باتیں کیں، اپنی تحصیل داری کی ایسی زیٹ اڑائی کہ رانی صاحبہ پر بھی جادو چل گیا۔ رانی صاحبہ نے سوچا اس آدمی کی لیاقت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ٹھاکر صاحب سے صلاح کی۔ انہوں اور بھی ردا جمایا۔ ان کے دوستوں میں بجر دھر ہی ایسے تھے جس پر لونگی کی نظر عنایت تھی۔ دوسری ہی سلامی میں منشی جی کو پچیس روپے ماہوار کی تحصیلداری مل گئی۔ منہ مانگی مراد پوری ہوئی۔ سواری کے لیے گھوڑا بھی ملا اور سونے پر سہاگہ ہو گیا۔

اس نوکری نے منشی جی کے ارمان پورے کر دیئے۔ جہاں مہینے میں ایک بار بھی نشاط کی محفل نہ جمنے پاتی وہاں اب تیسوں دن جمگھٹ ہونے لگا۔ اتنے بڑے اہلکار کے لیے شیشہ و ساغر کی کیا کمی۔ کبھی علاقہ میں چپکے سے دس بیس بوتلیں کھنچوا لیتے، کبھی شہر کے کسی کلوار پر دھونس جما کر دو چار بوتل اینٹھ لیتے۔ ایک کہار بھی نوکر رکھ لیا اور ٹھاکر صاحب کے گھر سے دو چار کرسیاں بھی اٹھوا لائے۔ ان کے حوصلے بہت اونچے نہ تھے۔ صرف ایک مغرور آدمی کی طرح زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ لیکن جانتے تھے کہ اس نوکری کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ رئیسوں کا مزاج ایک سا نہیں رہتا۔ مان لیا رانی صاحبہ کے ساتھ نبھ ہی گئی تو کے دن۔ نئے راجہ صاحب آتے ہی پرانے نوکروں کو نکال باہر کریں گے۔ جب دیوان صاحب ہی نہ رہیں گے تو میری کیا ہستی۔ اس لیے انہوں نے پیش بندی کے لیے راجہ

صاحب سے رسوخ پیدا کرنا شروع کر دیا۔ ان کا نام کنور بشال سنگھ تھا۔ رانی صاحبہ کے دیور ہوتے تھے۔ ان کے دادا دو بھائی تھے۔ بڑے بھائی ریاست کے مالک تھے۔ انہی کی اولاد نے دو پشتوں تک ریاست پر حکمرانی کی تھی۔ اب رانی کے لاولد ہونے کے باعث بشال سنگھ کے بھاگ جاگے تھے۔ ان کے دادا کو جو دو چار گاؤں گزارے کے لیے ملے تھے، انہی کو رہن بیع کر کے ان لوگوں نے پچاس سال کاٹ دیئے۔ یہاں تک کہ اب بشال سنگھ کا گزر بھی مشکل سے ہوتا تھا۔ اس پر خاندانی وقار کا نباہ بھی لازمی تھا۔ نوکر چاکر، سواری شکاری سبھی کچھ رکھنا پڑتا تھا۔ ابھی تک رسم قدیم کی نقل ہوتی چلی جاتی تھی۔

صبح کا وقت تھا۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ منشی بجر دھر گرم پانی سے نہائے۔ کپڑے پہنے۔ باہر گھوڑا تیار تھا۔ اس پر سوار ہو کر شیو پور چلے گئے۔ آٹھ بج گئے تھے۔ کنور صاحب دھوپ میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ منشی جی نے جا کر سلام کیا اور بڑے ادب سے ایک موڑھے پر بیٹھ گئے۔ بشال سنگھ نے پوچھا۔ ''کہیے۔ دربار کی کیا خبریں ہیں؟''

منشی جی نے مسکرا کر کہا۔ ''وہی پرانی رفتار ہے۔ دن میں تین ڈاکٹر آتے ہیں۔ روز جگدیش پور سے سولہ آدمی پالکی اٹھانے کے لیے بیگار پکڑ کر آتے ہیں۔''

کنور صاحب نے فلسفیانہ انداز سے کہا۔ ''اندھیر ہے اور کچھ نہیں۔ یہ بے انصافی ہے۔ بیچاری رعایا تباہ ہوتی جاتی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ میں اس رواج کو کیونکر جڑ سے اکھاڑ دیتا ہوں۔''

منشی بجر دھر نے کہا۔ ''آپ سے لوگوں کو بڑی امیدیں ہیں۔ چماروں پر بھی یہی آفت ہے۔ دس بارہ چمار روز گھاس چھیلنے کے لیے پکڑے جاتے ہیں۔ سنا ہے علاقہ بھر کے چماروں نے پنچایت کی ہے کہ جو سائیسی کریاس کا حقہ پانی بند کر دیا جائے۔ اب یا تو چماروں کو علاقہ ہی چھوڑنا پڑے گا یا دیوان صاحب کو سائیس نوکر رکھنے پڑیں گے۔''

کنور صاحب: چماروں کو علاقہ سے نکالنا دل لگی نہیں ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ابھی تک وہی دنیا ہے جو بابا آدم کے زمانہ میں تھی۔ دنیا میں انقلاب ہو گیا۔ کسان مزدور

فرمانروائی کرنے لگے۔ پر اب بھی ان لوگوں کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ آپ دیکھیں گے کہ میں ریاست کو کیا سے کیا کر دکھاتا ہوں۔ کایا پلٹ کر دوں گا۔ سنتا ہوں پولیس آئے دن علاقہ میں طوفان مچاتی رہتی ہے، میں پولیس کو وہاں قدم بھی نہ رکھنے دوں گا۔

بجر دھر: سڑکیں اتنی خراب ہوگئی ہیں کہ یکے گاڑی کا گزر بھی نہیں ہوسکتا۔

کنور صاحب: سڑکوں کو درست کرانا میرا پہلا کام ہوگا۔ موٹر سروس جاری کر دوں گا۔ جس سے مسافر کو اسٹیشن سے جگدیش پور جانے میں تکلیف نہ ہو۔ علاقہ میں لاکھوں بیگھے گنے کی کاشت ہوتی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ ایک شکر کی مل لگا دوں۔ شیخی نہیں مارتا علاقہ میں دھن برسنے لگے گا۔ آپ نے کوئی مہاجن ٹھیک کیا؟

بجر دھر: ہاں کئی آدمیوں سے ملا تھا۔ وہ صرف اتنا چاہتے ہیں کہ ضمانت کے طور پر کوئی گاؤں لکھ دیا جائے۔ ضمانت کے بغیر روپیہ ملنا مشکل ہے۔

کنور صاحب نے بے پروائی کی شان سے کہا۔ ''تو جانے دیجیے۔ کوئی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی میرے بھروسہ پر روپیہ دے تو دے، لیکن ریاست کی انچ بھر زمین رہن نہیں کرسکتا۔ میرے والد بزرگوار نے صرف پانچ ہزار قرض لیے تھے جس کے پچاس ہزار ہو گئے اور میرے تین گاؤں جو اس وقت دو لاکھ کو سستے تھے نیلام ہو گئے۔ اس غم میں وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کی آخری وصیت یہی تھی کہ اور چاہے جو کچھ کرنا قرض نہ لینا۔''

ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ زنان خانہ سے تو تو، میں میں کی صدائیں آنے لگیں۔ معلوم ہوتا تھا کئی عورتوں میں جنگ چھڑی ہے۔ ٹھاکر صاحب کی زندگی کا یہی سب سے دردناک پہلو تھا۔ ان کی تینوں بیویوں میں ہمیشہ بم چخ مچی رہتی تھی۔ بڑی بیوی کا نام بسومتی تھا۔ وہ نہایت خوددار اور مغرور عورت تھی۔ ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتی۔ وہ اپنی سوکنوں پر اس طرح حکومت کرنا چاہتی تھی جیسے ساس بہو پر کرتی ہے۔

دوسری بیوی کا نام رام پریا تھا۔ یہ رانی جگدیش پور کی سگی بہن تھی۔ رحم اور مروت کی

مورت تھی۔ بہت ذی فہم اور شیریں زبان تھی۔ جتنی نازک بدن تھی، اتنی ہی نازک طبیعت بھی تھی۔ گھر میں اس طرح رہتی تھی گویا ہے ہی نہیں۔ کتابوں سے خاص ذوق تھا۔ نہ کسی سے زیادہ دشمنی نہ کسی سے زیادہ محبت۔

تیسری بیوی کا نام رونی تھا۔ ٹھاکر صاحب کی اس پر خاص نظر عنایت تھی اور وہ بھی دل و جان سے ان کی خدمت کرتی تھی۔ اس میں الفت کو زیادہ دخل تھا یا حسد کا، اس کا تصفیہ کرنا ذرا مشکل ہے۔ انہیں یہ بھی گوارا نہ تھا کہ کنور صاحب کسی دوسری بیوی سے بات چیت بھی کر سکیں۔ بسوتی تند مزاج ہونے پر بھی تنگ دل نہ تھی۔ دل میں غبار نہ رکھتی تھی۔ رونی کہنے کو پالتی تھی جیسے چڑیا اپنے انڈے سیتی ہے۔

کنور صاحب نے اندر جا کر سوتی سے کہا۔ ''تم گھر میں رہنے دو گی یا نہیں؟ ذرا بھی شرم لحاظ نہیں۔ جب دیکھو جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ سنتے سنتے کلیجے میں ناسور پڑ گئے۔''

بسوتی: فعل تو تم نے کیے، بھوگے گا کون؟

کنور صاحب: تو زہر دے دو۔ جلا جلا کر مارنے سے کیا فائدہ؟

بسوتی: کیا چھوٹی رانی لڑنے کے لیے کم تھیں کہ تم ان کی حمایت کرنے دوڑے آئے۔

رونی: آپ چاہتی ہیں کہ مجھے کان پکڑ کر اٹھائیں یا بٹھائیں۔ تو یہاں کچھ گاؤں میں نہیں بسی ہوں۔

کنور صاحب: آخر کچھ معلوم بھی ہو کیا بات ہوئی؟

رونی: وہی جو روز ہوتی ہے۔ ہریا میرے سر میں تیل ڈال رہی تھی۔ بس جامہ سے باہر ہو گئیں۔ آج آپ اس کا فیصلہ کر دیجیے کہ ہریا ان کی خاص لونڈی ہے یا میری بھی؟

بسوتی: وہ کیا فیصلہ کریں گے۔ فیصلہ میں کروں گی۔ ہریا میرے ساتھ میرے میکے سے آئی ہے اور میری لونڈی ہے۔ اس پر کسی دوسرے کا دعویٰ نہیں ہے۔

رونی: سنا آپ نے۔ ہریا پر کسی کا دعویٰ نہیں۔ وہ انہی کی لونڈی ہے۔

کنور صاحب: ہریا اس گھر میں رہے گی تو اسے سب کا کام کرنا پڑے گا۔

بسومتی یہ سن کر جل اٹھی۔ ناگن کی طرح پھپکار کر بولی۔ ''اس وقت تو آپ نے چھیتی کی ایسی ڈگری کر دی گویا یہاں انہی کا راج ہے۔ ایسے منصف مزاج ہوتے تو اولاد کا منہ دیکھنے کو نہ ترستے۔''

کنور صاحب کے سینے میں تیر سا چبھا۔ کچھ جواب نہ سوجھا۔ باہر آ کر کئی منٹ تک کرب کی حالت میں بیٹھے رہے۔ بسومتی اتنی منہ پھٹ ہے اس کا انہیں گمان بھی نہ تھا۔ اگر طعنہ ہی دینا تھا تو کوئی اور لگتی ہوئی بات کہہ سکتی تھی۔ یہ مہلک ترین وار تھا جو وہ ان پر کر سکتی تھی۔

یکا یک انہیں ایک بات سوجھی۔ منشی جی سے بولے۔ ''جیوتشیوں کی پیشین گوئی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ اگر آپ کی یہاں کے کسی جیوتشی سے ملاقات ہو تو ذرا اسے میرے پاس بھیج دیجیے گا۔''

بجر دھر: بہت اچھا۔ آج ہی بھیج دوں گا۔ آپ مجھے کوئی غیر نہ سمجھے جب جس کام کی ضرورت ہو مجھے کہلا بھیجئے۔ میں تو جیسے مہارانی کو سمجھتا ہوں ویسے آپ کو سمجھتا ہوں۔

کنور صاحب: مجھے آپ سی ایسی ہی امید ہے۔ ہاں ایک بات اور پوچھنی تھی۔ بھلا اس کا پتہ لگایئے گا کہ آج کل رانی صاحبہ کا کھانا کون پکاتا ہے۔ پہلے تو ان کے میکے ہی کی کوئی عورت تھی۔

منشی جی نے ذرا تامل کے بعد کہا۔ ''حضور معاف کیجیے گا۔ میں آپ کا غلام ہوں، مگر رانی صاحبہ کا بھی غلام ہوں۔ ان کا دشمن نہیں۔ آپ اور وہ دونوں شیر اور شیرنی کی طرح لڑ سکتے ہیں۔ میں گیدڑ کی طرح اپنے فائدے کے لیے بیچ میں کودنا شرمناک سمجھتا ہوں۔''

کنور صاحب دل میں شرمائے پر اس کے ساتھ ہی منشی جی کی عزت ان کے دل میں اور زیادہ ہو گئی۔ بات بناتے ہوئے بولے۔ ''نہیں نہیں آپ نے میرا مطلب غلط سمجھا۔ چھی چھی، میں اتنا کمینہ نہیں ہوں۔''

کنور صاحب نے بات تو بنائی پر انہیں خود معلوم ہو گیا کہ بات بنی نہیں۔ جھینپ مٹانے کے لیے اخبار دیکھنے لگے۔ منشی جی نے بھی اب زیادہ بیٹھنا مصلحت نہ سمجھی۔ وہ یہاں سے چلے تو ان کے دل میں یہ خوف سمایا ہوا تھا کہ کنور صاحب مجھ سے ناراض تو نہیں ہو گئے مگر اتنا اطمینان تھا کہ میں نے وہی کیا جو حق تھا۔ اگر کوئی سچی بات کہنے سے ناراض ہو جاتا ہے تو ہو جائے۔ منشی جی اکڑ کر گھوڑے پر بیٹھ گئے۔ اپنی خودداری پر انہیں کبھی اتنا غرور نہ ہوا تھا۔ فکروں کو کبھی انہوں نے اتنا معتبر نہ سمجھا تھا۔

پانچ

چکر دھر کی شہرت ان سے پہلے ہی بنارس پہنچ چکی تھی۔ احباب ملنے کے لیے بے قرار ہو رہے تھے۔ جب وہ پانچویں دن گھر پہنچے تو اسٹیشن پر عقیدت مندوں کا ایک انبوہ کھڑا تھا۔ کئی دن اس کی چرچا رہی۔ اگرچہ چکر دھر منکسر المزاج واقع ہوئے تھے پر اپنی تعریف سن کر خوش ہوتے تھے۔ مسلمانوں کی تعداد کے متعلق کوئی غلطی ہوتی تو فوراً اسے صحیح کر دیتے تھے۔ ایک ہزار! اجی پورے پانچ ہزار آدمی تھے اور سبھی کی تیوریاں چڑھی ہوئی۔ معلوم ہوتا تھا مجھے کھڑا نگل جائیں گے۔ جان پر کھیل گیا تھا اور کیا کہوں اور لوگ تو تعریفیں کر رہے تھے پر منشی بجر دھر ان کی نادانی پر افسوس کر رہے تھے۔ نرملا تو اتنی بگڑی کہ چکر دھر سے بات نہ کرنا چاہتی تھی۔

شام کو چکر دھر منورما کے گھر گئے۔ وہ باغیچہ میں دوڑ، دوڑ کر ہزارے سے پودوں کو سینچ رہی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی ہزارہ پھینک کر دوڑی اور پاس آ کر بولی۔

''آپ کب آئے بابو جی؟ میں اخباروں میں روز وہاں کا حال دیکھتی تھی اور سوچتی تھی کہ آپ آئیں گے تو آپ کی پوجا کروں گی۔ آپ نہ ہوتے تو وہاں ضرور فساد ہو جاتا۔ آپ کو اتنے آدمیوں کے سامنے اکیلے جاتے ہوئے ذرا بھی خوف نہ ہوا؟''

چکر دھر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ذرا بھی نہیں۔ مجھے تو یہی دھن تھی کہ اس وقت قربانی نہ ہونے دوں گا۔ اب سوچتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے کہ مجھ میں اتنی قوت اور ہمت

کہاں سے آ گئی۔ میں تو یہی کہوں گا کہ مسلمانوں کو لوگ ناحق بدنام کرتے ہیں۔ فساد سے وہ بھی اتنا ہی ڈرتے ہیں جتنا ہندو۔ امن کی خواہش بھی ان میں ہندوؤں سے کم نہیں ہے۔''

منورما: میں نے تو جب پڑھا کہ آپ ان بوکھلائے ہوئے آدمیوں کے سامنے بے خوفی سے کھڑے تھے تو میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں اس وقت وہاں ہوتی تو آپ کو پکڑ کر کھینچ لیتی۔ اچھا تو بتلایئے کہ آپ سے بہو جی نے کیا باتیں کیں (مسکرا کر) میں تو جانتی ہوں کہ آپ دونوں لجائے بیٹھے رہے ہوں گے۔

چکر دھر شرم سے سر جھکا کر بولے۔ ''ہاں منورما، ہوا تو ایسا ہی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہوں۔''

منورما: آپ کو دیکھ کر خوش تو بہت ہوئی ہوں گی؟

چکر دھر شرما کر بولے۔ ''کسی کے دل کی حالت میں کیا جانوں؟''

منورما نے بھولے پن سے کہا۔ ''سب معلوم ہو جاتا ہے۔ آپ مجھے بتانا نہیں چاہتے۔ کم سے کم ان کی خواہش تو معلوم ہو ہی گئی۔ میں تو سمجھتی ہوں جو بیاہ لڑکی کی مرضی کے خلاف کیا جاتا ہے، وہ بیاہ نہیں ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟''

چکر دھر چکر میں پڑ گئے۔ منورما سے انہیں ایسی باتیں کرتے شرم محسوس ہو رہی تھی۔ ڈرتے تھے کہ کہیں ٹھاکر صاحب کو خبر نہ ہو جائے۔ بھولی منورما ہی کہہ دے تو وہ کیا خیال کریں گے کہ میں اس کے خیالات تبدیل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ سر جھکا کر بولے۔

''منورما ہمارے یہاں بیاہ کی بنیاد محبت اور مرضی پر نہیں بلکہ دھرم اور فرض پر رکھی گئی ہے۔ خواہشوں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ وہ لمحہ بہ لمحہ بدلتی رہی ہیں لیکن فرض ایک حقیقت ہے۔ اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔''

دفعتاً اندر سے کسی کی کرخت آواز کانوں میں آئی اور ساتھ ہی لونگی کے رونے کی آواز بھی سنائی دی۔ چکر دھر نے پوچھا۔ ''یہ لونگی رو رہی ہے۔''

منورما کی تیوریوں پر یہ کرخت آواز سنتے ہی بل پڑ گئے تھے۔ آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ بولی۔

''شاید بھائی صاحب آ گئے۔ نہ جانے ان کی کیسی عادت ہے کہ جب آتے ہیں تو لونگی اماں سے جھوٹ موٹ تکرار کرنے لگتے ہیں۔ بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کی ہیں پر شرافت کا نام بھی نہیں۔''

اتنے میں گرو سیوک سنگھ لال لال آنکھیں کیے اندر سے نکل آئے اور اسی کرخت لہجے میں منورما سے بولے۔ ''بابو جی کہاں گئے ہیں؟ تجھے معلوم ہے؟ میں آج فیصلہ کر لینا چاہتا ہوں۔''

چکر دھر کو بیٹھے دیکھ کر کچھ جھجکے اور اندر جانا چاہتے تھے کہ لونگی روتی ہوئی آ کر چکر دھر کے پاس کھڑی ہوگئی اور بولی۔ ''بابو جی انہیں سمجھائیے کہ میں بڑھاپے میں کہاں جاؤں؟ اتنی عمر تو اسی گھر میں کٹی۔ اب کس کے دروازہ پر ہاتھ پھیلاؤں۔ بابو جی سچ کہتی ہوں۔ میں نے انہیں اپنا دودھ پلا کر پالا ہے۔ مالکن کے دودھ نہ ہوتا تھا اور اب یہ مجھے گھر سے نکالنے پر تلے ہیں۔''

گرسیوک سنگھ کی خواہش تو نہ تھی کہ چکر دھر سے اس نزاع کے متعلق کچھ کہیں، لیکن جب لونگی نے انہیں پنچ بنانے میں تامل نہ کیا تو وہ بھی کھل پڑے۔ ''جناب اس سے یہ پوچھیے کہ اب یہ بڑھیا ہوئی۔ مرنے کے دن آئے۔ کیوں نہیں کسی تیرتھ استھان میں جا کر اپنی شرمناک زندگی کے بچے ہوئے دن کاٹتی۔ میں نے دادا سے کہا تھا کہ اسے برندابن پہنچا دیجیے۔ مگر یہ مرتے دم تک گھر کی مالکن بنی رہنا چاہتی ہے۔ دادا جی سٹھیا گئے ہیں۔ انہیں اپنے وقار کی ذرا بھی پروا نہیں۔ اس نے ان پر نہ جانے کونسا جادو کر دیا ہے کہ اس کی خاطر مجھ سے لڑنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ آج میں تہیہ کر کے آیا ہوں کہ اسے گھر سے نکال کر ہی چھوڑوں گا۔''

لونگی نے خودداری کی شان سے کہا۔ ''تو بچہ سنو۔ جب تک مالک جیتا ہے لونگی اس گھر

میں رہے گی۔ جب وہ نہ رہے گا تو جو کچھ سر پر پڑے گا جھیل لوں گی۔ جو تم چاہو کہ لونگی گلی گلی ٹھوکریں کھاتی پھرے تو یہ نہ ہوگا۔ میں لونڈی نہیں ہوں جو گھر سے باہر جا کر رہوں۔ نہیں مجھے یہ کہتے ہوئے شرم بھی نہیں آتی۔ چار بھانوریں پھر جانے سے ہی بیاہ نہیں ہو جاتا۔ میں نے اپنے مالک کی جتنی خدمت کی ہے اور کرنے کو تیار رہوں، اتنی کون بیاہتا کرے گی۔ لائے تو ہو بہو کبھی اٹھ کر ایک لوٹیا پانی دیتی ہے؟ نام سے کوئی بیاہتا نہیں ہوتی سیوا اور پریم سے ہوتی ہے۔''

یہ کہتی ہوئی لونگی گھر میں چلی گئی۔ منورما چپ چاپ سر جھکائے دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ اسے لونگی سے سچی محبت تھی۔ ماں کے پیار کو جو کچھ سکھ اسے ملا وہ لونگی ہی سے ملا تھا۔ اس کی ماں اسے گود میں چھوڑ کر سدھاری تھی۔ اس احسان کو وہ کبھی بھول نہ سکتی تھی۔

دفعتاً ایک فٹن آئی اور ٹھاکر صاحب اتر کر اندر گئے۔ گرسیوک سنگھ بھی ان کے پیچھے پیچھے گئے کہ لونگی کہیں موقع پا کر ان کے کان نہ بھر دے۔

جب وہ چلے گئے تو چکر دھر نے کہا۔ ''یہ بتاؤ تم نے ان چار پانچ دنوں میں کونسا کام کیا ہے؟''

''میں نے تو کتاب تک نہیں کھولی۔ آپ نہیں ہوتے تو میرا کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ میں آپ کو اب کبھی باہر نہ جانے دوں گی۔''

چکر دھر نے منورما کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں پر آب ہو گئی تھیں۔ سوچنے لگے لڑکی کتنی بھولی، کتنی شریف، کتنی روشن خیال اور کتنی ذی احساس ہے۔

چھ

منشی بجر دھر بشال سنگھ کے پاس سے لوٹے تو بیوی سے بولے۔ ''رئیس ہو تو ایسا کسی طرح چھوڑتے ہی نہ تھے۔ لڑ کر آیا ہوں۔ ان کے زمانہ میں رعایا چین کرے گی۔'' یہ تعریفیں سن کر چکر دھر کو بھی کنور صاحب سے ملنے کا شوق ہوا اور پہلی ہی ملاقات میں ان کے معتقد ہو گئے۔ اپنی انجمن کے سرپرستوں میں ان کا نام درج کر لیا۔ تب سے کنور

صاحب انجمن کے اجلاس میں ہمیشہ شامل ہوتے تھے۔ لہٰذا اس مرتبہ جب جنم اشٹمی کا جشن ہوا تو کنور صاحب اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس میں شریک ہوئے۔

کنور صاحب کرشن بھگت تھے۔ ان کا جنم دن بڑی دھوم دھام سے مناتے تھے، لیکن ان کی بیویوں میں اس معاملے میں اختلاف تھا۔ رونی جنم اشٹمی کا جشن مناتی تھی تو بسومتی رام نومی کے دن وہ نوراترے کا برت رکھتی زمین پر سوتی اور درگا پاٹھ سنتی رہتی۔ رہی رام پریا تو وہ کوئی برت نہ رکھتی۔ وہ کہتی اس نمائش سے فائدہ! دل صاف ہونا چاہیے۔ یہی سب سے بڑی عبادت ہے۔

شام ہوگئی تھی۔ چکر دھر اپنے دوستوں کے ساتھ آرائش میں مصروف تھے۔ گانا شروع ہونے والا تھا کہ بسومتی اور رونی میں تکرار ہوگئی۔ بسومتی جب رام نومی کی تقریب مناتی تھی، تو کنور صاحب کچھ کنارہ کش سے رہتے تھے۔ اس کے خیال میں اس موقع پر ان کی دلچسپی کا باعث کرشن بھگتی نہیں، رونی کی خاطر داری تھی۔ وہ دل میں جل بھن رہی تھی۔ رونی سولہ سنگھار کیے پکوان بنا رہی تھی۔ اس کی تیاریاں دیکھ کر بسومتی کے کلیجے پر سانپ لوٹ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ کوئی ناگہانی آفت آ جائے۔ سوچتے سوچتے اسے ایک بہانہ مل گیا۔ مہری کو بھیجا جا کر برتن مانگ لا۔ ان کا کھانا رات بھر پکتا رہے گا تو کوئی کب تک بیٹھا راہ دیکھتا۔ ''ایسی ہی جلدی ہے تو کمہار کے یہاں سے ہانڈیاں منگوالیں، پتل میں دے دوں گی۔''

رونی نے یہ سنا تو آگ بگولا ہوگئی۔ ''ہانڈیاں چڑھائیں میرے دشمن۔ میں کیوں ہانڈی چڑھاؤں۔ جشن منانے کا اتنا ہی شوق ہے تو نئے برتن کیوں نہیں منگوا لیتیں۔ اپنے کرشن سے کہہ دیں گاڑی بھر برتن بھیج دیں۔''

رونی رسوئی گھر سے باہر نکل کر بولی۔ ''بہن ذرا منہ سنبھال کر بات کرو۔ دیوتاؤں کی توہین کرنا اچھا نہیں۔''

بسومتی: توہین تم کرتی ہو۔ جو برت کے دن یوں بن ٹھن کر اٹھلاتی پھرتی ہو۔ دیوتا

رنگ روپ نہیں دیکھتے، دل دیکھتے ہیں۔

رونی: کیا آج لڑنے پر آمادہ ہو کر آئی ہو؟ ایشور سب دکھ دے پر برا ساتھ نہ دے۔ لو یہی گہنے کپڑے آنکھوں میں کھٹک رہے ہیں نا۔ نہ پہنوں گی۔ لے جاری مہری سب برتن اٹھا لے جا اور باہر جا کر کہہ دے جو کچھ بنوانا ہو کسی حلوائی سے بنوا لیں۔''

یہ کہہ کر رونی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ سارے گہنے کپڑے اتار پھینکے اور منہ ڈھانپ کر لیٹ رہی۔ اٹھا کر صاحب نے یہ خبر سنی تو دانت پیس کر بولے۔

''ان چڑیلوں سے آج بھی خاموش نہیں بیٹھا جاتا۔ اس زندگی سے تو موت ہی اچھی۔''

گھر میں آ کر رونی سے بولے۔ ''تم منہ ڈھانپ کر سو رہی ہو یا پکوان بناتی ہو۔''

رونی نے پڑے پڑے جواب دیا۔ ''ایسے تیوہار سے باز آئی جسے دیکھ کر دوسروں کی چھاتی پھٹے۔''

بشال سنگھ نے کہا۔ ''تم سے بار بار کہہ چکا کہ ان کے منہ نہ لگا کرو۔ پھر تم سے بڑی ہیں۔ یوں بھی تم کو ان کا لحاظ کرنا چاہیے۔''

جس دن بسومتی نے کنور صاحب کو اولاد کا طعنہ دیا تھا اسی دن سے انہوں نے اس سے بولنا چالنا چھوڑ دیا تھا۔ اس سے کچھ خائف رہنے لگے تھے، مگر رونی کیوں دبنے لگی تھی۔ جھنجھلا کر بولی۔ ''رہنے بھی دو جلے پر نمک چھڑکتے ہو۔ جب بڑا دیکھ دیکھ کر جلے، بات بات پر کوسے تو کوئی کہاں تک اس کا لحاظ کرے۔ الٹے مجھ کو ہی نصیحت کرتے ہو تم ہی نے اسے چڑھا لیا ہے۔ کوئی بات ہوتی ہے تو مجھے ہی نصیحت کرنے دوڑے آتے ہو۔ سیدھا پا لیا ہے نا۔ اس سے بولتے ہوئے تو تمہارا بھی کلیجہ کانپتا ہے۔ تم نہ شہہ دیتے تو مجال تھی کہ مجھے آنکھ دکھاتی۔''

بشال سنگھ: تو کیا میں انہیں سکھا دیتا ہوں کہ تمہیں گالیاں دیں؟

کنور صاحب جیوں جیوں رونی کا غصہ فرو کرنے کی کوشش کرتے تھے وہ اور بھی بپھرتی

جاتی تھی۔ یہاں تک کہ آخر کار کنور صاحب کو ہی نرم ہونا پڑا۔

بسومتی سائبان میں بیٹھی ہمہ تن گوش دونوں آدمیوں کی باتیں سن رہی تھی۔ گویا کوئی فوج کا سردار اپنے حریف کی نقل و حرکت کا مطالعہ کر رہا ہو کہ کب یہ چوکے اور کب میں دبا بیٹھوں۔ دم دم میں صورت حال تبدیل ہو رہی تھی۔ کبھی موقع نظر آتا تو پھر نکل جاتا۔ یہاں تک کہ بالآخر اس کی ایک بھدی چال نے اسے وہ مبارک موقع دے ہی دیا۔ بشال سنگھ کو منہ لٹکائے دیکھ کر بولی۔ ''کیا میری صورت دیکھنے کی قسم کھائی ہے؟ یا تمہارے حساب سے میں گھر میں ہوں ہی نہیں۔ بہت دن تو ہو گئے روٹھے ہوئے۔ کیا عمر بھر روٹھے رہو گے؟ اتنے دلگیر کیوں ہو؟''

بشال سنگھ نے ٹھٹھک کر کہا۔ ''تمہاری ہی لگائی آگ کو تو بجھا رہا ہوں پر الٹے ہاتھ جل گئے۔ یہ کیا روزانہ طوفان کھڑا کیا کرتی ہو۔ میں تو تنگ آ گیا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہیں بھاگ جاؤں۔''

''کہاں بھاگ کر جاؤ گے۔'' کہہ کر بسومتی نے آ کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ گھسیٹتی ہوئی اپنے کمرے میں لے گئی اور چارپائی پر بٹھاتی ہوئی بولی۔ ''عورتوں کو سر چڑھانے کی یہی سزا ہے۔ جب دیکھو اپنی قسمت کو کوستی رہتی ہے اور تم منانے دوڑتے ہو بس اس کا مزاج اور آسمان پر چڑھ جاتا ہے۔ دن چار دن، دس دن روٹھی پڑی رہنے دو۔ پھر دیکھو بھیگی بلی بن جاتی ہے یا نہیں۔''

بشال سنگھ: یہاں وہ الٹو انٹی کھٹوانٹی لے کر پڑی ہے۔ اب پکوان کون بنائے گا؟

بسومتی: تو کیا جہاں مرغا نہ ہو گا وہاں سویرا ہی نہ ہو گا۔ ایسا کونسا بڑا کام ہے، میں بنائے دیتی ہوں۔

کنور صاحب باغ باغ ہو کر بولے۔ ''بس تمہاری انہی اداؤں پر تو جان جاتی ہے۔ شریف گھرانے کی عورت کا یہی دستور ہے۔''

فتح کے نشے میں متوالی بسومتی آدھی رات تک بیٹھی طرح طرح کے پکوان بناتی رہی۔

رام پریا نے اسے بہت مصروف دیکھا تو وہ بھی آ گئی اور دونوں مل کر کام کرنے لگیں۔

بشان سنگھ کچھ دیر تو بیٹھے گانا سنتے رہے پر وہاں دل نہ لگا۔ پھر اندر چلے آئے اور رسوئی کے دروازے پر موڑھا ڈال کر بیٹھ گئے۔ خوف تھا کہ کہیں دونوں پھر نہ لڑ پڑیں۔

بسومتی نے کہا: ''ابھی مہارانی نہیں اٹھیں کیا؟ اس میں چھپ کر باتیں سننے کی بری لت ہے۔ محبت اسے چھو نہیں گئی۔ ابھی تم تین دن باہر کراتے رہے مگر قسم لے لو جو اس کو ذرا بھی درد ہوا ہو۔ ایسی عورتوں پر کبھی وشواس نہ کریں۔''

کنور صاحب: سب دیکھتا ہوں اور سمجھتا ہوں نرا گدھا نہیں ہوں۔

بسومتی: یہی تو رونا ہے کہ تم دیکھ کر بھی نہیں دیکھتے۔ جہاں اس نے مسکرا کر دیکھا مست ہو گئے۔ آدمی میں سب عیب ہوں زن مرید نہ ہو۔

کنور صاحب: میں زن مرید ہوں؟ میں اس سے ایسی ایسی باتیں کہتا ہوں کہ وہ بھی یاد کرتی ہوگی۔

رام پریا: کڑی بات بھی ہنس کر کہی جائے تو وہ میٹھی ہو جاتی ہے۔

کنور صاحب: ہنس کر نہیں کہتا۔ ڈانٹتا ہوں، پھٹکارتا ہوں۔

بسومتی: ڈانٹتے ہو گے پر محبت سے۔ ڈھلتی عمر میں سبھی مردوں کا یہی وطیرہ ہو جاتا ہے۔ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں تم سے لاکھ روٹھی ہوں لیکن تمہارا منہ ذرا بھی گرا دیکھا کہ جان نکل گئی۔ وہاں جب تک پیر نہ سہلاؤ دیوی جی سیدھی نہیں ہوتیں۔ آدمی کڑے دم چاہیے جس کا قصور دیکھے اسے ڈانٹے۔ خون پی لینے پر آمادہ ہو جائے۔ ایسے ہی مردوں سے عورتیں قابو میں آتی ہیں۔ اس کی ناز برداری کی اور آنکھوں سے گرا۔

کنور صاحب: اپنی دانست میں، میں نے کبھی لگام ڈھیلی نہیں کی۔ آج ہی دیکھ لو کیسی پھٹکار بتائی۔

بسومتی: کیا کہنا ہے۔ ذرا مونچھیں کھڑی کر لو۔ لاؤ پگیا میں سنوار دوں۔ یہ نہیں کہتے کہ اس نے ایسی چوٹیں کیں کہ بھاگتے ہی بنی۔

دفعتاً کسی کے پیروں کی آہٹ پا کر بسومتی نے دروازے کی طرف دیکھا۔ روپنی دبے پاؤں چلی جارہی تھی۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ دانتوں میں ہونٹ دبا کر بولی۔ ''چھپی کھڑی تھی۔ میں نے صاف دیکھا۔ اب گھر میں رہنا مشکل ہے۔ دیکھو کیا رنگ لاتی ہے۔''

کنور صاحب نے پیچھے کی طرف سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ ''بڑا غضب ہوا۔ چڑیل سب سن گئی ہوگی اور مجھے ذرا بھی آہٹ نہ ملی۔''

''اونہہ۔ رانی روٹھیں گی اپنا سہاگ لیں گی۔ کوئی کہاں تک ڈرے۔ آدمیوں کو بلاؤ اور یہ سب سامان یہاں سے لے جاؤ۔'' بسومتی نے منہ پھیر کر کہا۔

بھادوں کی اندھیری رات تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا زمین پاتال میں چلی گئی ہے۔ موم بتی کی روشنی اس اتھاہ تاریکی میں قدم رکھتی کانپتی تھی۔ بشال سنگھ تھالیوں میں پکوان بھر بھر کر باہر رکھوانے میں مصروف تھے۔ اتنے میں روپنی ایک چادر اوڑھے ہوئے گھر سے نکلی اور باہر کی طرف چلی۔ بشال سنگھ دروازے کی دہلیز کے پاس کھڑے تھے۔ اس بھری سبھا میں اسے یوں بے خوف باہر کی طرف نکلتے دیکھ کر ان کا خون جوش کھانے لگا۔ ذرا بھی نہ پوچھا کہ کہاں جاتی ہو؟ کیا بات ہے، بت کی طرح کھڑے رہے اور سب لوگ اپنے اپنے کام میں مصروف رہے۔ روپنی پر کسی کی بھی نگاہ نہ پڑی۔

اتنے میں چکر دھر کنور صاحب سے کچھ پوچھنے آئے تو دیکھا، مہری ان کے سامنے کھڑی ہے اور غصے سے آنکھیں لال کیے کہہ رہے ہیں۔ ''اگر وہ میری لونڈی نہیں ہے تو میں بھی اس کا غلام نہیں ہوں۔ جہاں اس کی مرضی ہو جائے۔ اب اس گھر میں لوٹ کر آئی تو سر کاٹ لوں گا۔''

چکر دھر کو رانیوں کے آپسی جھگڑے اور روپنی کے گھر سے نکل جانے کی بابت معلوم ہوا تو انہوں نے لپک کر ایک لالٹین اٹھائی اور باہر نکل کر دائیں بائیں نگاہیں دوڑاتے ہوئے تیزی سے چلے۔ کوئی دو سو قدم گئے ہوں گے کہ روپنی ایک درخت کے نیچے کھڑی دکھائی دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چھپنے کے لیے کوئی جگہ تلاش کر رہی ہے۔ چکر دھر اسے

دیکھتے ہی لپک کر اس کے قریب گئے اور اسے گھر واپس چلنے کے لیے سمجھانے لگے۔ پہلے تو رونی کسی طرح راضی نہ ہوتی لیکن چکر دھر کے بہت سمجھانے بجھانے پر وہ گھر کی طرف لوٹ آئی۔

جب دونوں گھر پہنچے تو کنور بشال سنگھ وہیں اسی طرح خاموش کھڑے تھے۔ رونی نے دہلیز میں قدم رکھا۔ مگر انہوں نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ جب اندر چلی گئی تو انہوں نے چکر دھر کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولے۔ ''میں تو سمجھتا تھا اب کسی طرح نہ مانے گی۔ مگر آپ کھینچ ہی لائے۔ کیا بہت بگڑتی تھیں؟''

''بڑی منتیں کیں تب جا کر راضی ہوئیں۔ مزاج بے حد نازک ہے۔''

''خیر ان کے مزاج کا رنگ بھی معلوم ہو گیا۔ اگر آپ نہ پہنچ جاتے تو بڑی مشکل میری ہی تھی۔ میرا غصہ بہت برا ہے۔ وہ بھی جان پر کھیل جانے والی عورت ہے۔ آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا۔ دیکھیے تو سامنے کچھ روشنی سی معلوم ہو رہی ہے۔ بینڈ بھی بج رہا ہے۔ کیا ماجرا ہے؟''

اس وقت بینڈ کی آواز قریب آ گئی اور ذرا دیر میں سینکڑوں آدمیوں کا ایک جلوس مسلح سپاہیوں کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔

سات

یہ وہ جلوس تھا جو کنور صاحب کو گدی کی خوش خبری دینے آیا تھا۔ ہر سیوک سنگھ اور بجر دھر اس جلوس کے سرغنہ تھے۔ کنور صاحب نے لوگوں کو لے جا کر فرش پر بٹھایا اور خود مسند پر بیٹھے۔ نذرانہ کی رسم ادا ہوئی۔ بینڈ ماسٹر نے مبارکباد کی، دھن بجائی پھر لوگوں کی پان اور الائچی سے تواضع کی گئی۔ کنور صاحب کا بار بار جی چاہتا تھا کہ اندر جا کر مژدہ سناؤں، پر موقع نہ پا کر ضبط کیے رہے۔ منشی جی نے ایک خط ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ خط مہارانی نے حضور کے نام لکھا ہے۔ وہ راج پاٹ چھوڑ کر تیرتھ استھان چلی گئی ہیں۔''

کنور صاحب نے ایک ہی نگاہ میں وہ خط پڑھ لیا اور ان کے چہرے پر دلی مسکراہٹ جھلکنے لگی۔ خط کو جیب میں رکھتے ہوئے بولے۔ ''حالانکہ مہارانی کے تیرتھ استھان جانے کی خبر پڑھ کر مجھے تکلیف ہوئی ہے، لیکن اس بات کی بھی خوشی ہے کہ انہوں نے اپنی عاقبت سدھارنے کے لیے مناسب قدم اٹھایا ہے۔ بھگوان مجھے اپنے فرض میں پورا اترنے کی طاقت دے۔''

اتنے میں کرشن کی ولادت کا وقت سعید آ پہنچا۔ ساری محفل کھڑی ہوگئی اور استادوں نے ہم آواز ہوکر مبارکباد گانا شروع کیا۔ سماں بندھ گیا۔ صرف دو آدمی ایسے تھے جن کے سر اس وقت بھی فکر سے دبے ہوئے تھے۔ ایک تھے ٹھاکر ہرسیوک سنگھ اور دوسرے کنور بشال سنگھ۔ ایک کو یہ فکر تھی کہ دیکھیں کل کیا مصیبت آتی ہے۔ دوسرے کو یہ فکر تھی کہ اس موذی سے کیوں کر پرانی کدورتیں نکالوں۔ چکر دھر اب تک شرم سے منہ چھپائے کھڑے تھے اور منشی بجر دھر کو اشارے سے دالان میں بلا کر پوچھنے لگے۔

''دیوان صاحب نے تو یہ خوب ہاتھ صاف کیے ہوں گے؟''

بجر دھر: میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں دیکھی۔ بیچارے دن بھر سامان کی جانچ پڑتال کرتے رہے۔ گھر تک نہ گئے۔

بشال سنگھ: یہ سب آپ کے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ آپ نہ ہوتے تو جانے کیا غضب ڈھاتے۔ آپ کو پرانا قصہ معلوم نہیں۔ اس نے مجھ پر بڑے ظلم کیے ہیں۔ اسی کے باعث مجھے جگدیش پور چھوڑنا پڑا۔ اس کا بس چلتا تو اس نے مجھے قتل کرا دیا ہوتا۔

بجر دھر: گستاخی معاف ہو حضور، آپ کا بس چلتا تو کیا رانی صاحبہ کی جان بچ جاتی یا دیوان صاحب زندہ ہوتے۔ ان پچھلی باتوں کو بھول جائیے۔ خدا نے آپ کو رتبہ بخشا ہے۔ اب آپ کو فراخ حوصلہ ہونا چاہیے۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں آپ کے دل میں نہ آنی چاہئیں۔ میں نے ٹھاکر صاحب کی زبان سے ایک بات بھی ایسی نہیں سنی جس سے یہ احساس ہوتا ہو کہ وہ آپ سے عداوت رکھتے ہیں۔

بشال سنگھ نے کچھ شرمندہ ہو کر کہا۔ ''میں نے عہد کر لیا تھا کہ پہلا وار انہی پر کروں گا، لیکن آپ کی باتوں نے میرا وہ خیال پلٹ دیا۔ آپ بھی انہیں سمجھا دیجیے گا کہ میری طرف سے کوئی ملال نہ رکھیں۔ ہاں رعایا پر ظلم نہ کریں۔''

یہ کہتے ہوئے کنور صاحب اندر گئے اور سب سے پہلے رونی کے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ پشت کی جانب کھڑکی کھولے ہوئے کھڑی تھی۔ اس تاریکی میں اسے شاید اپنا نوشتۂ تقدیر نظر آ رہا تھا۔ شوہر کی بے وفائی نے آج اس کی غرور سے اندھی آنکھیں کھول دی تھیں۔

کنور صاحب نے کمرے میں قدم رکھتے ہی کہا۔ ''رونی آج یہاں ہماری مرادیں پوری ہو گئیں۔ اب خوش ہو جاؤ۔''

رونی: اب تو گھر میں رہنا اور بھی مشکل ہو جائے گا۔ جب کچھ نہ تھا تب تو مزاج ہی نہ ملتا تھا۔ اب کوئی کیوں زندہ رہنے پائے گا۔

بشال سنگھ نے آزردہ خاطر ہو کر کہا۔ ''یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے دیوی۔ ایشور کا شکر کرو کہ اس نے ہماری دعا قبول کی۔''

رونی: جب اپنا کوئی رہا ہی نہیں تو راج پاٹ لے کر چاٹوں گی۔

بشال سنگھ کو غصہ تو آیا، لیکن اس خوف سے کہ بات بڑھ جائے گی، کچھ نہ بولے۔ وہاں سے بسومتی کے پاس پہنچے اور بولے۔ ''کیا سوتی ہو؟ اٹھو خوشخبری سنائیں۔''

بسومتی: پٹ رانی کو تو سنا ہی آئے۔ میں سن کر کیا کروں گی؟ اب تک جو بات دل میں تھی وہ آج تم نے کھول دی۔

بشال سنگھ نے معذرت کی۔ ''یہ بات نہیں ہے بسومتی۔ تم جان بوجھ کر نادان بنتی ہو۔ میں ادھر ہی آ رہا تھا۔ اس کا کمرہ اندھیرا دیکھ کر چلا گیا کہ دیکھوں کیا بات ہے۔''

بسومتی: مجھ سے باتیں نہ بناؤ سمجھ گئے۔ جو ایک عورت کو قابو میں نہ رکھ سکے وہ رعایا کا بار کیا سنبھالے گا؟

کنور صاحب نے اس کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور رام پریا کے کمرے میں داخل ہوئے۔ دیکھا تو وہ رو رہی ہے۔ بشال نے گھبرا کر پوچھا۔

''کیا بات ہے؟ رو کیوں رہی ہو؟ میں خوشخبری سنانے آیا ہوں۔''

رام پریا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔''سن چکی ہوں۔ مگر آپ اسے خوشخبری کیسے کہتے ہیں۔ میری پیاری بہن ہمیشہ کے لیے دنیا سے رخصت ہوگئی۔ یہ کیا خوشخبری ہے؟ اس دکھیا نے سنسار کا کچھ سکھ نہ دیکھا۔ روتے روتے ہی ساری عمر گزر گئی۔''

یہ کہہ کر وہ پھر سسکنے لگی۔ کنور صاحب کو اس کا رونا برا معلوم ہوا۔ باہر آ کر محفل میں بیٹھ گئے۔ مینڈو خاں ستار بجا رہے تھے۔ ساری محفل پر محویت کا عالم طاری تھا۔ جو لوگ فضلو کا گانا نہ سن سکتے تھے وہ بھی اس وقت سر دھنتے اور جھومتے نظر آتے تھے۔ مگر اس مسرت اور جشن کے عالم میں بھی ایک شخص خلش باطن سے بے قرار تھا۔ یہ کنور بشال سنگھ تھے۔ ساری بارات ہنستی تھی مگر دولہا رو رہا تھا۔

آٹھ

دوسری برسات بھی آدھی سے زیادہ گزر گئی، لیکن چکر دھر نے ماں باپ سے اہلیا کی سرگزشت پوشیدہ رکھی۔ جب منشی جی پوچھتے وہاں کیا باتیں ہوئیں تو کچھ ادھر ادھر کی باتیں کر کے ٹال دیتے۔ ادھر جسودا نندن بار بار لکھتے ''تم نے منشی جی سے صلاح کی یا نہیں'' تو ان سے بھی اسی طرح حیلے کرتے۔

جمع اشٹمی کے جلسے کے بعد منشی جی گھر آئے تو ان کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ راجہ صاحب کے ساتھ ہی ان کا ستارۂ اقبال بھی روشن ہوتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اب اس بات کی ضرورت نہ تھی کہ وہ فریق ثانی سے دبیں۔ اب وہ مان مانا جہیز لے سکتے تھے اور دھوم دھام سے شادی کر سکتے تھے۔ لیکن جسودا نندن کو زبان دے چکے تھے۔ اس لیے ان سے ایک بار پوچھنا لازم تھا۔ اگر ان کی طرف سے آنا کانی ہو تو صاف کہہ دینا چاہتے تھے کہ مجھے اپ کے گھر شادی کرنا منظور نہیں۔ آخر ایک دن انہوں نے چکر دھر سے کہا۔''یہ

جسودانندن بھی کچھ عجیب آدمی ہیں۔ ابھی تک کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے ہیں۔''

چکر دھر نے دیکھا اب موقع آ گیا ہے، بولے۔ ''انہیں تو کوئی پس و پیش نہیں، پس و پیش جو کچھ ہوگا آپ ہی کی طرف سے ہوگا۔ بات یہ ہے کہ وہ لڑکی جسودانندن کی بیٹی نہیں ہے۔''

بجر دھر: بیٹی نہیں ہے؟ وہ تو بیٹی ہی بتلاتے تھے۔ تمہارے سامنے کی تو بات ہے۔ خیر نہ ہوگی۔ بھتیجی ہوگی، بھانجی ہوگی، پوتی ہوگی، نواسی ہوگی، مجھے آم کھانے سے مطلب یا پیڑ گننے سے۔

چکر دھر: وہ لڑکی انہیں کسی میلے میں ملی تھی۔ تب اس کی عمر تین چار برس تھی۔ انہیں اس پر رحم آ گیا۔ گھر لا کر پالا پوسا، پڑھایا لکھایا۔

بجر دھر سناٹے میں آ گئے۔ بیوی سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''کتنا دغاباز آدمی ہے۔ کیا ابھی تک لڑکی کے ماں باپ کا پتہ نہیں چلا؟''

چکر دھر نے جواب دیا۔ ''جی نہیں۔ منشی جی نے ان کا کھوج لگانے کی بہت کوشش کی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔''

بجر دھر: اچھا تو یہ قصہ ہے۔ بڑا چھوٹا آدمی ہے۔ بنا ہوا مکار۔

نرملا نے کہا۔ ''تم صاف صاف لکھ دو مجھے نہیں کرنا ہے رشتہ بس۔''

''میں تم سے صلاح نہیں پوچھتا۔ میں خوب جانتا ہوں ایسے دھوکے بازوں سے کیسے پیش آنا چاہیے۔''

کھانا کھا کر دونوں آدمی اٹھے تو منشی جی نے کہا۔ ''قلم دوات لاؤ۔ میں اسی وقت جسودانندن کو لکھ دوں۔ برادری کا معاملہ نہ ہوتا تو ہرجانہ کا دعویٰ کر دیتا۔''

چکر دھر نے ہچکتے ہوئے کہا۔ ''مگر میں تو زبان دے آیا ہوں۔''

بجر دھر: تو یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم نے سب کچھ خود ہی طے کر لیا۔ پھر مجھ سے کیا صلاح پوچھتے ہو۔ تم نے لڑکی حسین دیکھی اور رجھ گئے۔ مگر یاد رکھو عورت میں حسن ہی سب سی

بڑی صفت نہیں ہے۔ میں تمہیں ہرگز شادی نہ کرنے دوں گا۔

چکر دھر: میرا خیال ہے کہ مرد ہو یا عورت۔ حسن سیرت ہی اس کا سب سے بڑا وصف ہے۔

بجر دھر: تمہارے سر نئی روشنی کا بھوت تو نہیں سوار ہو گیا۔ یکا یک یہ کیا کایا پلٹ ہو گئی؟

''میری سب سے بڑی تمنا یہی ہے کہ آپ لوگوں کی خدمت کروں۔ آپ کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کروں لیکن اپنے اصولوں کی خاطر مجبور ہوں۔''

بجر دھر: خدمت نہیں کرنا چاہتے بلکہ کالک لگانا چاہتے ہو۔ مگر یاد رکھو تم نے یہ شادی کی تو اچھا نہ ہوگا۔ بھگوان وہ دن نہ لائے کہ میں اپنے خاندان میں کلنک لگتے دیکھوں۔

چکر دھر: تو میرا بھی یہی فیصلہ ہے کہ میں اور کہیں شادی نہ کروں گا۔

یہ کہتے ہوئے چکر دھر باہر چلے آئے اور جسودا نندن کو ایک خط لکھ کر سارا ماجرا بیان کر دیا۔ ان کے آخری الفاظ تھے۔ ''والد صاحب راضی نہیں ہوتے اور اگرچہ اصول کے معاملے میں، میں ان سے دبنا نہیں چاہتا لیکن ان کی مرضی کے خلاف کوئی حرکت کر کے میں اس ضعیفی کے عالم میں انہیں صدمہ نہیں پہنچانا چاہتا۔ آپ سے میری التجا ہے کہ اس معاملے میں مجھے معذور سمجھیں۔''

اس کے بعد انہوں نے دوسرا خط اہلیا کے نام لکھا۔ یہ کام اتنا آسان نہ تھا۔ تین بجے جا کر کہیں یہ خط تمام ہوا۔ اس کے آخری الفاظ یہ تھے۔ ''اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ میری آزادروی سے والدین کو روحانی صدمہ ہوگا تو میں یہ روحانی اذیت نہ برداشت کرتا، لیکن میں سب کچھ تمہارے ہی فیصلہ پر چھوڑتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تمہارا فیصلہ ایک فرض شناس ہندو عورت کے شایان شان ہوگا۔''

دونوں خطوں کو ڈاک گھر میں ڈالتے ہوئے وہ منورما کو پڑھانے چلے گئے۔

نو

مدت کے بعد جگدیش پور کے بھاگ جاگے۔ برسات ختم ہوتے ہی محلوں کی مرمت

ہونے لگی اور دوسری طرف گدی نشینی کے جشن کی تیاری ہونے لگی۔

کنور صاحب نے سختی سے تاکید کر دی تھی کہ رعایا پر ذرا بھی سختی نہ ہونے پائے۔ دیوان صاحب سے انہوں نے زور دے کر کہہ دیا تھا کہ بغیر پوری مزدوری دیئے کسی سے کام نہ لیا جائے۔ یہ ان کی طاقت سے باہر تھا کہ آٹھوں پہر بیٹھے رہیں۔ ان کے پاس اگر کوئی شکایت پہنچی تو شاید عملہ کے لوگوں کو پھاڑ کھاتے، لیکن رعایا فرمانبردار ہوتی ہے۔ جب تک پیمانہ صبر لبریز نہ ہو جائے حرف شکایت زبان پر نہیں لاتی۔ پھر گدی کے جشن کے لیے تھوڑی سی سختی لازمی سمجھ کر اور بھی کوئی نہ بولتا تھا۔

تین مہینے تک ساری ریاست کے بڑھئی، لوہار، درزی، چمار، کہار، کمہار سبھی دل توڑ کر کام کرتے رہے۔ چکر دھر کو روز رعایا پر بے جا ظلم کی شکائتیں ملتی رہتی تھیں، لیکن وہ راجہ صاحب سے کچھ کہہ کر انہیں پریشان نہ کرنا چاہتے تھے۔ اکثر خود جا کر مزدوروں اور کاریگروں کو سمجھاتے تھے۔ محل کی درستی ہوگئی اور گدی کے جشن کے لیے پنڈال بھی تیار ہو گیا، سارے قصبہ میں صفائی سجاوٹ نظر آ رہی تھی۔

اب تک تو بہت کچھ کام بیگار سے چل گیا تھا۔ مزدوروں کو صرف کھانا کھلا دیا جاتا تھا۔ اب نقد رقم کی ضرورت تھی۔ مہمانوں کی خاطر مدارت اور حکام کی تواضع تکریم تو بیگار میں نہیں ہوسکتی تھی۔ خرچ کا تخمینہ پانچ لاکھ سے زیادہ تھا۔ خزانہ میں کوڑی نہ تھی۔ اسامیوں سے چھ ماہی لگان پہلے ہی وصول کیا جا چکا ہے۔ تاریخ سر پر آتی جاتی ہے، پر روپیہ کا کوئی انتظام نہیں ہوسکا۔

شام کا وقت تھا۔ کنور صاحب استاد مینڈو خاں کے ساتھ بیٹھے ستار کی مشق کر رہے تھے کہ دیوان صاحب اور منشی جی آ کر کھڑے ہو گئے۔

کنور صاحب نے پوچھا۔ ''کوئی ضروری کام ہے؟''

ٹھاکر صاحب: حضور جشن میں اب صرف ایک ہفتہ رہ گیا ہے اور ابھی تک روپے کا انتظام نہیں ہوسکا۔ اگر ارشاد ہو تو کسی بینک سے قرض لے لیا جائے۔

راجہ صاحب: ہرگز نہیں۔

دیوان: تو اسامیوں پر ہل پیچھے دس روپے چندہ لگا دیا جائے۔

راجہ صاحب: اس سے کہیں اچھا ہے کہ یہ تقریب ہی نہ منائی جائے۔

دیوان صاحب نے منشی جی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ریاستوں کا پرانا رواج ہے۔''

منشی جی نے تائید کی۔ ''سب خوشی سے دیں گے۔''

راجہ صاحب نے بہت دیر تک غور کرنے کے بعد جواب دیا۔ ''یہ تجویز مجھے مطلق پسند نہیں، لیکن اگر آپ لوگوں کے خیال ہے کہ اسامیوں کو کوئی تکلیف نہ ہوگی تو آپ اپنی ذمہ داری پر یہ کام کر سکتے ہیں۔ مگر میرے کانوں تک کوئی شکایت نہ آئے۔''

''حضور شکایت کیسے نہ آئے گی۔ اسامیوں کو تو شکایت کا مرض ہے۔ رونا تو ان کی گھٹی میں پڑا ہے۔ ریاست کا کوئی ملازم علاقہ میں جاتا ہے تو اسے روپے نہیں ملتے اور کوئی مکار جٹا بڑھا کر پہنچ جاتا ہے تو مہینوں اس کی خاطر ہوتی ہے۔ راجہ اور رعایا کا تعلق ایسا ہے۔

منشی جی نے کہا۔ ''جب حضور نے کہہ دیا کہ آپ اپنی ذمہ داری پر وصول کر سکتے ہیں تو پھر اور کیا رہ گیا۔ چلیے اب حضور کو تکلیف نہ دیجیے۔''

راجہ صاحب: بس اتنا ہی خیال رکھیے کہ کسی پر سختی نہ ہونے پائے۔

حکم ملنے کی دیر تھی عملہ کے ہاتھ تو کھجلا ہی رہے تھے، وصولی کا حکم صادر ہو گیا تو باغ باغ ہو گئے۔ پھر تو وہ اندھیر مچا کہ سارے علاقہ میں کہرام مچ گیا۔ چاروں طرف نوچ کھسوٹ ہو رہی تھی، کسی کے بیل کھول لیے جاتے تھے کسی کی گائے چھین لی جاتی تھی۔ کتنوں ہی کے کھیت کٹوا لیے گئے۔ جس نے خوشی سے دے دیا اس کی دس روپے میں گلو خلاصی ہو گئی۔ جس نے حیلے حوالے کیے یا سرکشی جتائی اسے دس کے بدلے بیس، تیس، چالیس دینے پڑے۔ آخر مجبور ہو کر ایک دن چکر دھر کو راجہ صاحب سے شکایت کرنی ہی پڑی۔

راجہ صاحب نے تیوری بدل کر کہا۔ ''میرے پاس تو آج تک کوئی اسامی فریاد کرنے نہیں آیا۔ پھر آپ کیوں وکالت کر رہے ہیں؟''

چکر دھر: انہیں آپ سے شکایت کرنے کا کیوں کر حوصلہ ہو سکتا ہے؟

راجہ صاحب: یہ میں نہیں مانتا۔ جس کے پاؤں میں کانٹا چبھتا ہے۔ وہ ہائے ہائے کرتا ہی ہے۔

چکر دھر نے مایوسانہ انداز سے پوچھا۔ ''تو آپ سے انصاف کی کوئی امید نہ رکھوں۔''

راجہ صاحب نے امارت کی شان سے جواب دیا۔ ''میں اپنے مقلدوں سے کوئی الگ چیز نہیں ہوں۔''

چکر دھر نے اس معاملے میں اور کچھ کہنا فضول سمجھا۔ وہ ابھی محل میں ہی تھے کہ منشی جی آ گئے اور انہیں دیکھ کر بولے۔ ''تم یہاں آ کر یوں ہی لوٹ جاتے ہو۔ اپنے لیے کچھ نہیں کیا؟''

چکر دھر: اپنے لیے کہنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ آج کل تو علاقہ میں بڑا اندھیر مچا ہوا ہے۔

منشی جی نے مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا۔ ''یہ سب تمہاری سیوا سمتی والوں کی شرارت ہے۔ وہی لوگ جا کر اسامیوں کو بھڑکاتے ہیں۔''

چکر دھر: ہم لوگ تو صرف اتنا چاہتے ہیں کہ رعایا پر سختی نہ کی جائے اور کنور صاحب نے اس کا وعدہ بھی کیا تھا۔ پھر یہ مار دھاڑ کیوں؟

بجر دھر: اسی لیے کہ اسامیوں سے کہہ دیا گیا ہے کہ راجہ صاحب کسی پر جبر نہیں کرنا چاہتے۔ جس کی مرضی نہ ہو نہ دے۔ تم اپنے آدمیوں کو بلا لو پھر دیکھو کتنی آسانی سے روپے وصول ہوتے ہیں۔ تم آج ہی اپنے والنٹیروں کو بلا لو۔ ریاست کے ملازم ان سے بےطرح بگڑے ہوئے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ فساد ہو جائے۔

چکر دھر نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ کچھ فیصلہ ہی نہ کر سکے۔ اسی دبدھا میں پڑے

ہوئے منورما کے یہاں چلے گئے۔

منورما نے انہیں اداس دیکھ کر پوچھا۔ ''آج آپ بہت متفکر نظر آتے ہیں۔ گھر میں تو سب خیریت ہے؟''

چکردھر نے رنجیدہ ہو کر کہا۔ ''کیا کروں منورما۔ اپنی حالت دیکھ کر کبھی کبھی رونا آ جاتا ہے۔ سارا ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ پھر بھی ہم اپنے بھائیوں کی گردن پر چھری پھیرنے سے باز نہیں آتے۔ راجہ صاحب سے لوگوں کو کتنی امیدیں تھیں۔ پر انہوں نے وہی پرانی روش اختیار کر لی۔ جشن کے لیے ڈنڈے کے زور سے روپے وصول کیے جا رہے ہیں اور کوئی فریاد نہیں سنتا۔ سب سے زیادہ رونا تو اس بات کا ہے کہ یہ سارا ظلم دیوان صاحب اور دادا جی کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔''

دل پر درد ظلم و ستم کا ذکر سن کر گرم ہو جاتا ہے۔ منورما نے جوش کے ساتھ کہا۔

''آپ اسامیوں کو منع کیوں نہیں کر دیتے کہ کسی کو ایک کوڑی نہ دیں۔''

چکردھر کو ہنسی آ گئی بولے۔ ''تم میری جگہ ہوتیں تو اسامیوں کو منع کر دیتیں؟''

منورما: بے شک اعلانیہ کہتی، خبردار! راجہ کے آدمیوں کو کوئی ایک پیسہ بھی نہ دے۔ میں تو راجہ کے آدمیوں کو اتنا پٹواتی کہ پھر علاقہ میں جانے کا نام بھی نہ لیتے۔

چکردھر نے پھر ہنس کر پوچھا۔ ''اور دیوان صاحب سے کیا کہتیں؟''

''ان سے بھی یہی کہتی کہ آپ سیدھے گھر چلے جائیں نہیں تو اچھا نہ ہوگا۔''

چکردھر نے روحانی مسرت کا احساس کر کے کہا۔

''اگر دیوان صاحب خفا ہو جاتے؟''

منورما: تو خفا ہو جاتے۔ کسی کے خفا ہونے کے خوف سے حق پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ اگر وہ آج آ گئے تو میں آج ہی کہوں گی۔

اس مسئلے پر پھر کچھ بات چیت نہ ہوئی۔ چکردھر آج پڑھا کر چلے تو ان کے دل میں سوال اٹھ رہا تھا کہ کیا اب میرا یہاں آنا مناسب ہے۔ آج انہوں نے حقیقت کی روشنی

میں اپنے باطن کو دیکھا تو وہاں کتنے ہی ایسے جذبات روپوش تھے، جنہیں وہاں نہیں رہنا چاہیے تھا۔ مرض جب تک تکلیف دہ نہ ہو جائے، ہم اس کی پروا نہیں کرتے۔ بچوں کی گالیاں ہنسی میں اڑائی جاتی ہیں۔ لیکن بالغوں کی گالیاں کون سہے گا۔ اس انکشاف نے چکر دھر کے سامنے دوسرا ہی مسئلہ پیش کر دیا۔

دس

گدی کے کئی دن قبل ہی سے مہمان آنے شروع ہو گئے اور تین دن باقی تھے کہ سارا کیمپ بھر گیا۔ دیوان صاحب نے کیمپ میں ہی بازار لگوا دیا تھا وہیں۔ رسد پانی کا بھی انتظام تھا۔ راجہ صاحب خود مہمانوں کی خاطر داری کرتے رہتے تھے۔ مگر جمگھٹا بہت بڑا تھا۔ ہر وقت ہڑبونگ سی مچی رہتی تھی۔

مہمانوں کی تو یہ آؤ بھگت تھی اور وہ مزدور جو چھاتی پھاڑ کر کام کرتے تھے، کوئی ان کی خبر نہ لیتا تھا۔ کام لینے کو سب تھے، کھانے کو پوچھنے والا کوئی نہیں۔ چمار بہت رات سے گھاس کھودنے جاتے۔ مہتر پہر رات سے صفائی کرنے لگتے۔ کہار پہر رات سے پانی کھینچنا شروع کرتے۔ مگر کوئی ان کا پرسان حال نہ تھا۔ چپڑاسی انہیں بات بات پر گالیاں سناتے۔ کیونکہ انہیں خود بات بات پر پھٹکار ملتی تھی۔ چپڑاسی برداشت کر لیتے تھے، کیونکہ انہیں دوسروں پر اپنا غصہ اتارنے کا موقع مل جاتا تھا۔ بیگاروں سے نہ سہا جاتا تھا کیونکہ ان کی آنتیں جلتی تھیں۔ دن بھر دھوپ میں جلتے اور رات بھر بھوک کی آگ میں۔ بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ نہ جانے کب بارود میں آگ لگ جائے۔

شام کا وقت تھا، تلک کا مہورت قریب تھا۔ ہون کی تیاری ہو رہی تھی، سپاہیوں کو وردی پہن کر قطار میں کھڑے ہونے کا حکم دیا جا چکا تھا کہ یکایک مزدوروں کے باڑے سے گریہ وزاری کی صدائیں آنے لگیں۔ کسی کیمپ میں گھاس نہ تھی۔ اور دیوان صاحب ہنٹر لیے چماروں کو پیٹ رہے تھے۔ منشی بجر دھر کی آنکھیں غصہ سے لال ہو رہی تھیں۔

چماروں کے چودھری نے دست بستہ عرض کیا۔ ''حجور، گھاس رات ہی کو پہنچا دی گئی

تھی۔ ہاں اس وقت نہیں پہنچی۔ آدھے آدمی تو ماندے پڑے ہوئے ہیں کیا کروں؟''

منشی بجردھر نے فرمایا۔ ''جھوٹ بولتا ہے، سور، ڈیم فول، راسکل، شیطان کا بچہ، ابھی بولو کیا ہوگا۔ گھوڑے بنا گھاس کیسے دوڑیں گے؟''

ایک نوجوان نے کہا۔ ''ہم لوگ بنا کھائے آٹھ دن سے گھاس دے رہے ہیں، کیا گھوڑے بنا کھائے ایک دن بھی نہ دوڑیں گے؟''

چودھر ڈنڈا لے کر اس گستاخ کو مارنے دوڑا، پر اس کے پہلے ہی دیوان صاحب نے جھپٹ کر اسے چار پانچ ہنٹر سڑاپ سڑاپ لگا دیئے۔ برہنہ جسم، جلد کٹ گئی اور خون بہہ نکلا۔

چودھری نے دیوان صاحب اور نوجوان کے درمیان کھڑے ہو کر کہا۔ ''ہجور کیا مار ہی ڈالوگے۔ لڑکا ہے کچھ جا بے جا منہ سے نکل جائے تو ماپھ کرنا چاہیے۔ راجہ کو دیاوان ہونا چاہیے۔''

ایک چمار کا یہ حوصلہ کہ ان کے سامنے زبان کھولے۔ وہی ہنٹر تان کر چودھری کو جما دیا۔ بوڑھا آدمی تھا اور اس پر کئی دن کا بھوکا، ہنٹر پڑتے ہی گر پڑا۔ باڑے میں ہلچل پڑ گئی۔ ہزاروں آدمی جمع ہو گئے۔ کتنے ہی چماروں نے مارے خوف کے کھرپی اور رسی اٹھالی تھی اور گھاس کھودنے جا رہے تھے۔ چودھری کو ہنٹر کھا کے گرتے دیکھا تو رسی کھرپی پھینک دی اور آ کر چودھری کو اٹھانے لگے۔

ٹھاکر صاحب نے تڑپ کر کہا۔ ''سب کے سب جا کر ایک گھنٹہ میں گھاس لاؤ ورنہ ہڈیاں توڑ دوں گا۔''

ایک چمار بولا۔ ''ہم یہاں کام کرنے آئے ہیں۔ جان دینے نہیں آئے ہیں۔ جس سے چاہے کام کرائیے۔ ہم گھر جاتے ہیں۔''

منشی جی نے تحصیلداری کی شان سے کہا۔ ''جس نے باڑے کے باہر قدم رکھا، اس کی شامت آئی۔ توپ پر اڑا دوں گا۔''

لیکن چماروں کے سر پر بھوت سوار تھا۔ بوڑھے چودھری کو اٹھا کر سب کے سب باڑے کے دروازے کی طرف لے چلے۔ ادھر سپاہیوں نے آ کر دروازہ روک لیا کیمپ میں کھلبلی مچ گئی۔ طرح طرح کی افواہیں اڑنے لگیں۔ راجہ صاحب اپنے خیمہ میں تلک کے بھڑکیلے بھڑکیلے لباس میں بیٹھے تھے، یہ خبر سنی تو تلملا گئے۔ طیش میں آ کر وہ اپنی بندوق لیے ہوئے خیمہ سے نکل آئے اور کئی آدمیوں کے ساتھ باڑے کے دروازہ پر آ پہنچے۔

چودھری اس اثنا میں جھاڑ پونچھ کر اٹھ بیٹھا تھا، راجہ صاحب کو دیکھتے ہی بولا۔ ''دہائی ہے مہاراج کی، سرکار بڑا اندھیر ہو رہا ہے۔''

راجہ صاحب: تم سب پہلے باڑے کے دروازے سے ہٹ جاؤ۔ پھر جو کچھ کہنا ہو مجھ سے کہو۔ اگر کسی نے باڑے کے باہر قدم رکھا تو جان سے مارا جائے گا۔

چودھری: سرکار نے ہم کو کام کرنے کے لیے بلایا ہے یا جان لینے کے لیے؟

راجہ صاحب: اگر کام نہ کرو گے تو جان سے جاؤ گے۔

چودھری: کام تو آپ کا کریں۔ کھانا کس کے گھر کھائیں؟

راجہ صاحب: کیا بے ہودہ باتیں کرتے ہو چپ رہو۔ تم سب کے سب مجھے بدنام کرنا چاہتے ہو۔ تم نیچ ہو اور نیچ لاتوں کے بغیر سیدھا نہیں ہوتا۔

چودھری: کیا اب ہماری پشت پر کوئی نہیں ہے کہ مار کھاتے رہیں اور زبان نہ کھولیں؟ اب تو سیوا سمتی ہماری پشت پر ہے، کیا وہ کچھ بھی انصاف نہ کرے گی؟

راجہ صاحب: اچھا تو اب تجھے سیوا سمتی کا گھمنڈ ہو گیا۔

چودھری: ہے ہی۔ وہ ہماری اچھا کرتے ہیں تو کیوں نہ گھمنڈ کریں؟

راجہ صاحب ہونٹ چبانے لگے۔ ''تو یہ سمتی والوں کی کارستانی ہے۔ چکر دھر میرے ساتھ چال چل رہے ہیں۔ لالہ چکر دھر جن کے والد میری خوشامد کی روٹیاں کھاتے ہیں، دیکھتا ہوں وہ میرا کیا کر لیتے ہیں؟ ان بے وقوفوں کے سر سے یہ بھوت اتار دینا چاہیے۔ یہ زہریلے کیڑے اگر پھیل گئے تو آفت مچا دیں گے۔''

چودھری تو یہ باتیں کر رہا تھا۔ ادھر باڑے میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ مسلح سپاہیوں کی صورت دیکھ کر جن کا خون سرد ہو جاتا تھا، وہ اس وقت بندوقوں کے سامنے مرنے کو تیار کھڑے تھے۔ آخر دروازے سے نکلنے کا راستہ نہ پا کر کچھ آدمیوں نے باڑے کی لکڑیاں اور رسیاں کاٹ ڈالیں اور ہزاروں آدمی یلغاریں مار مار کر نکل پڑے۔ گویا اُمڈی ہوئی ندی باندھ توڑ کر نکل پڑی۔ اسی وقت ایک طرف سے مسلح سپاہی اور دوسری طرف سے چکر دھر سمتی کے کئی نوجوانوں کے ساتھ آتے ہوئے دکھائی دیئے۔

انہیں دیکھتے ہی ہڑتالیوں میں جان سی پڑ گئی۔ جیسے نادان بچہ اپنی ماں کو دیکھ کر شیر ہو جائے۔ ہزاروں آدمیوں نے انہیں گھیر لیا۔ ''بھیا آ گئے'' کی آوازوں سے ماحول گونج اٹھا۔

چکر دھر نے اونچی آواز میں کہا۔ ''کیوں بھائیو! تم مجھے اپنا دوست سمجھتے ہو یا دشمن؟''

چودھری: بھیا، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ تم ہمارے مالک ہو۔ ہمارا سہارا ہو۔

چکر دھر اس بھیڑ سے نکل کر سیدھے راجہ صاحب کے پاس آ کر بولے۔ ''مہاراج۔ اگر اجازت ہو تو آپ سے کچھ عرض کروں۔''

راجہ صاحب نے تیوریاں بدل کر کہا۔ ''میں اس وقت کچھ نہیں سننا چاہتا۔''

چکر دھر: اگر آپ کچھ نہ سنیں گے تو پچھتائیں گے۔

راجہ صاحب: میں ان سبھوں کا گولی مار دوں گا۔

چکر دھر: غریب رعایا کے خون سے راج تلک لگانا کسی راجہ کے لیے شبھ نہیں ہو سکتا۔ رعایا کا آشیرواد ہی راجہ کی طاقت ہے۔ میں آپ کا خادم ہوں، بھی خواہ ہوں۔ اس لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ یہ سارا طوفان کم اندیش عمال کا کھڑا کیا ہوا ہے۔ انہی کی کج فہمیوں کے باعث آج آپ ان کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ گولی چلا کر آپ ان کی جان لے سکتے ہیں۔ مگر رحم سے آپ ان کا دل لے سکتے ہیں جو جان سے کہیں زیادہ قیمتی چیز ہے۔ تاج پوشی کا دن مبارک اور لطف و عنایت کی بارش کا ہے

خونریزی کا نہیں۔ اگر آج ایک خون ہو گیا تو اس کی چھینٹیں چنگاریوں کی طرح اڑ اڑ کر ریاست کو ایسا مشتعل کریں گی کہ پھر کوئی طاقت اس مسئلہ کو فرو نہ کر سکے گی۔

راجہ صاحب اپنی ٹیک پر اڑنا جانتے تھے، پر اس وقت ان کا دل کانپ اٹھا۔ کچھ نرم ہو کر بولے۔

''میں خود نہیں چاہتا کہ میری جانب سے کسی پر بھی ظلم کیا جائے۔ ان احمقوں کو اگر کوئی شکایت تھی تو انہیں آ کر مجھ سے کرنی چاہیے تھی۔ اگر میں سماعت نہ کرتا تو انہیں اپنے فعل کا اختیار تھا۔ مگر ان لوگوں نے مجھ سے کہا نہیں فساد کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ کسی کیمپ میں گھاس کا تنکا نہیں ہے اور یہ سب بھاگے جا رہے ہیں۔ میں یہ توہین برداشت نہیں کر سکتا۔''

چکر دھر: آپ نے ان لوگوں کو اپنی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ہی کب دیا ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ ان غریبوں کو ایک ہفتہ سے کوئی خوراک نہیں ملی۔

راجہ صاحب: ایک ہفتہ سے خوراک نہیں ملی! یہ آپ کیا کہتے ہیں؟ میں نے سخت تاکید کی تھی کہ ہر ایک مزدور کو پوری خوراک اور دونوں وقت دی جائے۔ کیوں دیوان صاحب یہ کیا معاملہ ہے؟

دیوان صاحب: حضور ان حضرات کے مغالطے میں نہ آئیں۔ یہ ساری آگ انہی کی لگائی ہوئی ہے۔

منشی بجر دھر: مہاراج یہ لڑکا ناسمجھ ہے۔ دوسروں نے جو کہہ دیا اسے سچ سمجھ لیتا ہے۔

راجہ صاحب: میں اس کی تحقیقات کروں گا۔

دیوان صاحب: حضور یہ لوگ رعایا سے کہتے پھرتے ہیں سب آدمی برابر ہیں۔ کسی کو تمہارے اوپر حکومت کرنے کا حق نہیں۔ کسی کو تم سے بیگار لینے کا حق نہیں۔ اسی لیے رعایا سرکش ہو گئی ہے۔ زمین کے مالک تم ہو۔ جو زمین سے فصل اگائے وہی اس کا مالک ہے۔ راجہ تو تمہارا غلام ہے۔

راجہ صاحب: بہت ٹھیک کہتے ہیں۔ اس میں تو مجھے شکایت کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ میں فی الواقع رعایا کا غلام ہوں، بلکہ اس کے غلام کا غلام ہوں۔

دیوان صاحب: حضور ان کی ہرزہ سرائی کی کوئی انتہا نہیں۔ کہتے پھرتے ہیں۔ راجہ کو اتنے بڑے محل میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ وہ غاصب ہے۔

راجہ صاحب: بہت صحیح کہتے ہیں۔ آخر میں بڑے بڑے کھانے کے سوا اور کیا کرتا ہوں؟

چکر دھر نے جھنجھلا کر کہا۔ ''دیوان صاحب آپ میرے آقا ہیں اور میں آپ کا ادب کرتا ہوں، لیکن ان غلط بیانیوں کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ میں نے رعایا کو ان کے حق سے ضرور آگاہ کیا ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا کہ راجہ غاصب ہے اور اسے دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔''

راجہ صاحب: میں تو مطلق برا نہیں مانتا۔ آپ نے تو کوئی ایسی بات نہیں کہی جو اور لوگ نہ کہتے ہوں۔

چکر دھر کو معلوم ہوا کہ راجہ صاحب مجھے بنا رہے ہیں، تو چیں بہ جبیں ہو کر بولے۔ ''اگر آپ کے جذبات سچے ہوتے تو رعایا کو یہ مظالم نہ سہنے پڑتے۔ راجاؤں کا یہ پرانا طریقہ ہے کہ رعایا کا دل میٹھی میٹھی باتوں سے بھریں اور اپنے ملازموں کو من مانی کرنے کی اجازت دیں۔ وہ راجہ جس کے کانوں تک غربا کی فریاد نہ پہنچے.....''

راجہ صاحب نے بات کاٹ کر کہا۔ ''اسے گولی مار دینی چاہیے۔ زندہ دیوار میں چنوا دینا چاہیے۔ رعایا کا غلام ہے کہ مذاق ہے۔''

چکر دھر اس طنز کے متحمل نہ ہو سکے۔ ان کی خلقی رواداری نے ساتھ چھوڑ دیا۔ فدائیانہ جوش سے بولے۔ ''جس اصول کے سامنے آپ کو سر جھکانا چاہیے اس کا مضحکہ اڑانا آپ کو زیب نہیں۔ مجھے کبھی یہ گمان نہ تھا کہ آپ کے قول اور فعل میں اتنا بڑا اختلاف ہوگا۔''

راجہ صاحب ابھی تک تو طنز و تضحیک سے چکر دھر کو مغلوب کرنا چاہتے تھے، لیکن جب چکر دھر کے وار ہونے لگے تو انہیں بھی تلوار نیام سے باہر کرنی پڑی۔ ڈپٹ کر بولے۔

''اچھا اب زبان بند کیجیے۔ میں جتنی طرح دیتا ہوں، اتنے ہی آپ شیر ہوتے جاتے ہیں۔ میں رعایا کا غلام نہیں ہوں۔ رعایا میرے قدموں کی خاک ہے۔ مجھے اختیار ہے کہ اس کے ساتھ جو سلوک مناسب سمجھوں کروں۔ کسی غیر کو میرے اور میری رعایا کے بیچ میں بولنے کا حق نہیں ہے۔ آپ مہربانی کر کے یہاں سے تشریف لے جائیے اور پھر میری ریاست میں قدم نہ رکھیے گا۔ ورنہ شاید آپ کو پچھتانا پڑ جائے۔''

منشی بجر دھر کا سینہ دھک دھک کر رہا تھا۔ چکر دھر کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولے۔ ''حضور کی عنایتوں نے اسے گستاخ کر دیا ہے۔ ابھی تک تہذیب یافتہ صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق نہیں ہوا تو انہیں تمیز کہاں سے آئے۔''

چکر دھر بھی جوان آدمی تھے اور اس پر اصولوں کے پکے، نصب العین پر مر مٹنے والے، اختیار اور اقتدار کے جانی دشمن۔ وہ راجہ صاحب کے غیظ و غضب سے مطلق مرعوب نہ ہوئے۔ ہاتھ چھڑا کر سامنے آ گئے اور بولے۔ ''آپ کو اپنے منہ سے ایسے الفاظ کہتے شرم آنی چاہیے۔ آپ کے خیالات کتنے پاکیزہ تھے۔ آپ اپنے کو رعایا پر قربان کر دینا چاہتے تھے۔ آپ کہتے تھے رعایا کے لیے میرے دروازے آٹھوں پہر کھلے رہیں گے۔ میرے کارکن ان کی طرف ٹیڑھی نگاہوں سے دیکھ بھی نہ سکیں گے۔ وہ ساری باتیں آپ بھول گئے اور اتنی جلد اب آپ فرماتے ہیں کہ رعایا میرے قدموں کی خاک ہے۔''

راجہ صاحب کہاں تو غصہ سے پاگل ہو رہے تھے، کہاں اس بے رحمانہ چوٹ سے رو پڑے۔ ندامت تھی یا عزت۔ اپنی کمزوری کا احساس تھا یا مجبوری کا یہ صدمہ کہ یہ شیطان میری اتنی توہین کرتا ہے اور میں کچھ نہیں کر سکتا۔ پھر اچانک سنبھل کر بولے۔

''میں کہتا ہوں یہاں سے چلے جاؤ۔''

چکر دھر: جب تک ان ستم زدوں کو آپ جانے نہ دیں گے میں یہاں سے نہ جاؤں گا۔

راجہ صاحب: میرے آدمیوں سے تمہیں کوئی سروکار نہیں۔ ان میں سے اگر ایک بھی

ہلاتو اس کی لاش زمین پر ہوگی۔

چکر دھر: تو میرے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ انہیں اس قید سے آزاد کراؤں۔

یہ کہہ کر چکر دھر مزدوروں کی طرف بڑھے۔ راجہ صاحب کو معلوم تھا کہ ان کا اشارہ پاتے ہی مزدور ہوا ہو جائیں گے۔ پھر مسلح فوج بھی انہیں نہ روک سکے گی۔ طیش میں آ کر بندوق لیے ہوئے چکر دھر کے پیچھے پیچھے دوڑے اور ایسے زور سے ان پر کندا چلایا کہ سر پر پڑتا تو شاید وہیں ٹھنڈے ہو جاتے۔ مگر خیر ہوئی کہ پیٹھ میں لگا اور وہ گر پڑے۔ ان کا گرنا تھا کہ مزدوروں کا وہ ٹڈی دل باڑے کو توڑ کر مسلح سپاہیوں کی دیوار کو چیرتے ہوئے باہر نکل آیا اور راجاؤں کے کیمپ کی طرف چلا۔ راستہ میں راجہ کا جو بھی ملازم ہاتھ آ گیا اس کی مرمت کر دی۔ خبر اڑی کہ بلوہ ہو گیا۔ دوکاندار دکانیں سمیٹنے لگے۔ تماشائیوں نے راہ فرار اختیار کی۔ چاروں طرف بھگدڑ مچ گئی۔

ہمارے روساء عالی مقام اپنے نفس کے سوا اور کسی کے غلام نہیں۔ وقت کی غلامی بھی انہیں گوارا نہیں۔ وہ کسی قسم کی پابندی کو اپنی آزادی میں مخل نہیں ہونے دیتے۔ پھر انہیں اس کی کیا پروا کہ صبح ہے یا شام۔ کوئی میٹھی نیند کے مزے لیتا تھا۔ کوئی گانا سنتا تھا اور کچھ لوگ منڈپ میں جانے کی تیاریوں میں سرگرم تھے۔ کہیں بھنگ گھٹتی تھی۔ کہیں شاعری کا چرچا تھا اور کہیں پہلوانوں کے جوڑ چھوٹ رہے تھے۔ کوئی جسم پر تیل کی مالش کرا رہا تھا۔ اگر فتنہ انگیزوں کی جماعت اس کیمپ میں پہنچ جاتی تو غضب ہی ہو جاتا۔ مگر اہل ثروت کی حفاظت ان کا اقبال کرتا ہے۔ انگریزی کیمپ میں بھی دس بارہ فوجی افسر ابھی شکار کھیل کر لوٹے تھے۔ انہوں نے جو یہ ہنگامہ دیکھا تو نشانہ بازی کا سنہرا موقع سمجھ کر بندوقیں لے کر باہر نکل آئے اور نشانہ بازی کے جوہر دکھانے لگے۔

ایک آدمی نے اپنے رفیقوں سے کہا۔ ''ہاں بہادرو بس ایک اس کی کسر ہے، گھس

پڑو۔ اب کہاں جاتے ہیں۔ مارلیا ہے۔''

دوسرا: ''پھانسی پر تو چڑھنا ہی ہے پھر انہیں کیوں چھوڑیں.....؟''

اس کے منہ کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ گولیوں کی دوسری باڑھ آئی اور کئی آدمیوں کے ساتھ دونوں آدمیوں کا کام کرگئی۔ ایک لمحہ کے لیے سب کے پاؤں رک گئے۔

یکا یک ایک نوجوان نے کہا۔ ''مارو۔ رک کیوں گئے؟ سامنے پہنچ کر ہمت چھوڑ دیتے ہو۔ بڑھے چلو، جے درگا مائی۔''

انگریزی کیمپ سے پھر گولیوں کی باڑھ آئی اور کئی آدمیوں کے ساتھ یہ نوجوان بھی گر گیا اور اس کے گرتے ہی سارے مجمع میں کھلبلی مچ گئی۔ ابھی تک ان لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ گولیاں کدھر سے آرہی ہیں۔ ایک چمار بولا۔ ''گورے لوگ گولیاں چلا رہے ہیں۔ چلو ان کی خبر لیں۔''

کئی باڑھیں چلیں۔ کئی آدمی گرے، مگر جماعت بڑھتی ہی گئی۔ آخر ایک دستہ انگریزی کیمپ کی طرف مڑا۔ نشانہ بازوں نے دیکھا کہ بلوائی ہمارے قریب پہنچ گئے تو ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بندوقیں ہاتھ سے گر پڑیں۔ قریب تھا کہ جنون کا یہ خونی سیلاب اپنی تباہ کن، اندھی روانی کو یادگار ثروت کی نیم جاں سسکتی ہوئی لاشوں اور اقتدار کے مٹے ہوئے نشانات کی صورت میں چھوڑ جائے کہ چکر دھر پچھلی صفوں کو چیرے ہوئے بے تحاشا دوڑتے ہوئے آکر بولے۔

''بس بس ہاتھ روکو۔ خدا کے لیے ہاتھ روکو۔ کیا غضب کرتے ہو۔''

لوگوں نے حیران ہو کر دیکھا تو چکر دھر تھے۔ سینکڑوں لوگوں نے انہیں گھیر لیا۔

ایک مزدور نے کہا۔ ''ہمیں اپنے ایک سو آدمیوں کے خون کا بدلہ لینا ہے۔''

چکر دھر نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا۔ ''خبردار کوئی ایک قدم بھی آگے نہ بڑھے۔''

مزدور نے پھر کہا۔ ''یارو ایک ہلہ اور۔''

چکر دھر: ہم پھر کہتے ہیں اب ایک قدم بھی آگے نہ اٹھے۔

ضلع کے مجسٹریٹ مسٹر جم نے کہا۔ ''بابو صاحب خدا کے لیے ہمیں بچائیے۔''

فوج کے کپتان مسٹر سم بولے۔ ''ہم ہمیشہ آپ کو دعا دیں گے۔ ہم سرکار سے آپ کی سفارش کریں گے۔''

ایک مزدور: ہمارے ایک سو جوان بھون ڈالے گئے تب آپ کہاں تھے؟ یارو! کھڑے کیا ہو، بابو جی کا کیا بگڑا ہے۔ مارے تو ہم سب گئے ہیں نا؟ مارو سب کو۔

چکر دھر بلوائیوں کے سامنے کھڑے ہو کر بولے۔ ''اگر تمہیں خون کی ایسی ہی پیاس ہے تو میں حاضر ہوں۔ میری لاش کو پیروں سے کچل کر تبھی تم آگے بڑھ سکتے ہو۔''

''بھیا۔ چکر دھر تم سامنے سے ہٹ جاؤ۔ اس وقت دل کی آگ بجھا لینے دو۔ مرنا تو ہے ہی...''

چکر دھر نے کہا۔ ''اگر وہ آگ خون سے بجھے گی تو پہلا خون میرا ہوگا۔''

ایک مزدور نے کہا۔ ''ہماری پھانسی تو ہو ہی جائے گی تم ماپھی نہ دلا دو گے۔''

مسٹر جم: ہم کسی کو سزا نہ دیں گے۔

چکر دھر: انعام ملے یا پھانسی۔ اس کی کیا پروا۔ ابھی تک تمہارا دامن خون کی چھینٹوں سے پاک ہے۔ اسے پاک رکھو۔ ایشور کی نگاہ میں تم بے گناہ ہو۔ اب اپنے کو گناہ گار نہ کرو۔

بلوائیوں نے دیکھا۔ آگے جانا ناممکن ہے۔ پہلا قدم چکر دھر کے سینہ پر ہوگا۔ کچھ کڑھتے، کچھ دل میں جھنجھلاتے اور آئندہ کسی موقع پر دل کا ارمان نکالنے کا منصوبہ باندھتے واپس ہو گئے۔ ایک لمحہ میں میدان صاف ہو گیا۔ اتنے آدمی کدھر غائب ہو گئے کچھ پتہ نہ چلا۔

جس طرح پانی آ جانے سے کوئی میلہ اٹھ جاتا ہے۔ خریدار، دوکاندار اور ان کی دوکانیں سب خدا جانے کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اس سیلاب کے آ جانے

سے کیمپ میں سناٹا چھا گیا۔ صرف شاندار پنڈال سے ابھی تک شعلے اٹھ رہے تھے۔ راجہ صاحب اور ان کے مشیر کھڑے حسرت ناک نظروں سے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے گویا شمشان میں کھڑے کسی لاش کا جلنا دیکھ رہے ہوں۔

اندھیرا چھا گیا تھا۔ زخمیوں کے کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ چکر دھر اور ان کے رفقا انہیں احتیاط سے اٹھا اٹھا کر شفاخانے پہنچانے کا انتظام کرنے لگے۔ جو اٹھانے کے قابل نہ تھے ان کی مرہم پٹی وہیں ہونے لگی۔ لاشیں ایک درخت کے نیچے جمع کی جانے لگیں۔ اس وقت ندی لے جانے کا انتظام کرنا مشکل تھا۔ کئی والنٹیر لاشوں کی نگرانی کے لیے مقرر کر دیئے گئے۔

یکا یک کئی سپاہیوں نے آ کر چکر دھر کو گرفتار کر لیا اور انگریزی کیمپ کی طرف لے چلے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ جم صاحب کا حکم ہے۔

وہاں کچہری لگی ہوئی تھی۔ مسلح سپاہی جنھیں اب لوٹ سے فرصت مل چکی تھی۔ دروازے پر سنگینیں چڑھائے کھڑے تھے۔ اندر مسٹر جم اور مسٹر سم خوفناک صورت بنائے سگار پی رہے تھے۔ گویا غصہ کی آگ منہ سے اگل رہے ہوں۔ راجہ صاحب مسٹر جم کی بغل میں بیٹھے تھے۔ دیوان صاحب غصہ سے آنکھیں سرخ کیے میز پر ہاتھ رکھے کچھ کہہ رہے تھے اور منشی بجر دھر ہاتھ باندھے ایک کونہ میں کھڑے تھے۔

چکر دھر کو دیکھتے ہی مسٹر جم نے کہا۔ ''راجہ صاحب کہتا ہے کہ یہ سب تمہاری شرارت ہے۔''

چکر دھر طیش میں آ کر بولے۔ ''راجہ صاحب اگر آپ کا یہ خیال ہے تو مجھے اس کا افسوس ہے۔ ہم لوگ عوام میں جاگرتی ضرور پھیلاتے ہیں۔ ان میں تعلیم کا شوق پیدا کرتے ہیں۔ انہیں خودغرض حکام کے پھندوں سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور انہیں اپنی خودداری کی حفاظت کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ وہ انسان بنیں اور انسانوں کی طرح دنیا میں رہیں۔ وہ خودغرض لوگوں کے غلام نہ بنیں اور سرکاری

ملازموں کی خوشامد نہ کریں۔ خوف کی وجہ سے توہین اور ظلم برداشت نہ کریں۔ اگر اسے کوئی بھڑکانا سمجھتا ہے تو سمجھے۔ ہم تو اسے اپنا فرض سمجھتے ہیں۔''

جم: تمہارا بیان سن کر کون کہہ سکتا ہے کہ تم انہیں نہیں بھڑکاتا؟

چکر دھر: یہاں ان لوگوں پر ظلم ہو رہا تھا اور انہیں یہاں سے چلے جانے کا یا کام نہ کرنے کا حق حاصل تھا۔ اگر انہیں بے روک چلے جانے دیا جاتا تو یہ نوبت نہ آتی۔

راجہ صاحب: راج کے مطابق ہمیں بیگار لینے کا حق ہے اور اپنا حق ہم نہیں چھوڑیں گے۔ آپ اسامیوں کو بیگار دینے سے منع کرتے ہیں اور آج کے قتل عام کی ساری ذمہ داری آپ کے سر ہے۔

چکر دھر: کوئی بے انصافی اس لیے قابل قبول نہیں ہوسکتی کہ لوگ اسے رواج کا نام دیتے ہیں۔

جم: تمہارے اوپر بغاوت کا مقدمہ چلائے گا، Dangerous (خطرناک) آدمی ہو۔

راجہ صاحب: حضور میں ان کے ساتھ کوئی سختی نہیں کرنا چاہتا۔ صرف یہ حلف نامہ لکھانا چاہتا ہوں کہ یہ اور ان کے ساتھی میری ریاست میں قدم نہ رکھیں۔

چکر دھر: میں ایسا کوئی حلف نہیں لے سکتا۔ غریبوں پر ظلم ہوتے دیکھنا اور دور کھڑے رہنا یہ وہ حالت ہے جو ہم کسی حالت میں برداشت نہیں کر سکتے۔

مسٹر جم نے سب انسپکٹر سے کہا۔ ''اس کو حوالات میں رکھو۔ کل اجلاس میں پیش کرو۔''

بجر دھر نے آگے بڑھ کر جم کے پیروں پر پگڑی رکھ دی اور بولے۔ ''حضور یہ غلام کا لڑکا ہے۔ اس کی جان بخشی کر دیں۔''

مسٹر جم: او! تحصیلدار صاحب یہ تمہارا لڑکا ہے؟ تم اس کو گھر سے نکالا کیوں نہیں؟ سرکار تم کو اس لیے پینشن نہیں دیتی کہ تم باغیوں کو پالو۔ ہم تمہارا پینشن بند کر دے گا۔

راجہ صاحب: بابو چکر دھر ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ آپ حلف نامہ لکھ کر شوق سے گھر جا

سکتے ہیں ۔ میں آپ کو تنگ نہیں کرنا چاہتا ۔ ہاں اتنا ہی چاہتا ہوں کہ پھر ہنگامے کھڑے نہ ہوں ۔

چکر دھر : راجہ صاحب معاف کیجیے ۔ جب تک بے اطمینانی کی وجوہات دور نہ ہوں گی ۔ ایسی وارداتیں ہوں گی اور ضرور ہوں گی ۔ مجھے آپ پکڑ سکتے ہیں، قید کر سکتے ہیں، اس سے آپ کو اطمینان ہوگا ۔ پر وہ بے اطمینانی ذرہ بھر بھی کم نہ ہوگی جس سے رعایا کی زندگی تلخ ہوگئی ہے ۔

گیارہ

شام ہوگئی ہے ۔ ایسی امس ہے کہ سانس لینا مشکل ہے اور جیل کی کوٹھریوں میں وہ اور بھی نا قابل برداشت ہوگئی ہے ۔ ایک بھی کھڑکی نہیں ۔ ایک بھی روزن نہیں ۔ اس پر مچھروں کا نغمۂ شیریں اور بھی ستم ڈھا رہا ہے ۔

یہیں ایک کوٹھری میں چکر دھر بیٹھا ہوا ہے ۔ آزادی اپنے سچے پرستاروں کو یہی منصب عطا کرتی ہے ۔ وہ سوچ رہا ہے ۔ یہ خونریز ہنگامہ کیوں ہوا ۔ میں نے تو کبھی بھول کر بھی کسی سے یہ تحریک نہیں کی پھر لوگوں کے دل میں یہ بات کیسے سمائی ؟ اس سوال کا اسے یہی جواب مل رہا ہے کہ یہ ہماری نیت کا نتیجہ ہے ۔ ہمارے پیغام صلح کی تہہ میں نفس پروری چھپی ہوئی ہے ۔ اگر ہماری نیت صاف ہوتی تو مخلوق کے دلوں میں راجاؤں پر چڑھ دوڑنے کا جوش ہی نہ پیدا ہوتا، لیکن زیادتی تو پولیس کی تھی ۔ جو چھیڑ چھیڑ کر لڑنا چاہے، اس سے کوئی کیوں کر بچے ؟ پھر اگر ظلم کی مخالفت نہ کی جائے تو تنظیم سے فائدہ ہی کیا ۔ مشکل مسئلہ ہے یا تو رعایا کو اس کے حال پر چھوڑ دوں ۔ ان پر جتنے بھی ظلم ہوں، انہیں نظر انداز کر دوں یا ایسے ہنگاموں کے لیے تیار رہوں ۔ حکومت حیوانی طاقت کا دوسرا نام ہے ۔ راجہ سادھو نہیں ہیں ۔ جن کی طاقت دھرم ہوتی ہے ۔ وہ عالم نہیں جن کی طاقت منطق ہے ۔ وہ سپاہی ہیں جو ڈنڈے کے زور سے اپنی غرض پوری کرتے ہیں ۔ اس کے علاوہ ان کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں ۔

یہ سوچتے سوچتے انہیں اپنا خیال آیا۔ میں تو کوئی تحریک نہیں چلا رہا تھا۔ کسی کو بھڑکا بھی نہیں رہا تھا۔ جن لوگوں کی زندگی کی حفاظت کے لیے اپنی جان کی بازی لگائی وہی میرے ساتھ یہ سلوک کرر ہے ہیں۔ اتنا بھی نہیں دیکھ سکتے کہ اسامیوں پر کسی کا اثر ہو۔ ان کی خواہش اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ سب آدمی اپنی اپنی آنکھیں موند لیں۔ انہیں اپنے آگے پیچھے دائیں بائیں دیکھنے کا حق نہیں۔ اگر خدمت کرنا گناہ ہے تو یہ گناہ میں تا زندگی کرتا رہوں گا۔ جیل کی کیا فکر۔ خدمت کے لیے سب مقام برابر ہیں۔ جیل میں تو اور بھی زیادہ موقع ہے۔ لالہ جی کو دکھ ہوگی۔ اماں جی روئیں گی، لیکن مجبوری ہے۔ جب باہر بھی زبان پر تالے لگائے جائیں تو جیسے باہر ویسے جیل۔ باہر بھی، ایک قسم کی جیل ہی ہے۔ہاں اس کی وسعت قدرے زیادہ ہے۔ میں کبھی بھی خلف نامہ داخل نہیں کروں گا۔

وہ اسی غور و فکر میں تھے کہ یکا یک منشی بجر دھر کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے جسم پر ایک پرانی اچکن تھی۔ جس کا میل اس کے اصلی رنگ کو چھپائے ہوئے تھا۔ نیچے ایک پتلون تھی۔ جو کمر بند نہ ہونے کے باعث کھسک کر اتنی نیچی ہوگئی تھی کہ گھٹنوں کے نیچے ایک جھول سا پڑ گیا تھا۔ دنیا میں کپڑے سے زیادہ بے وفا اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ تحصیلدار صاحب چکر دھر کے پاس آ کر بولے۔ ''کیا کرتے ہو بیٹا۔ یہاں تو بڑا اندھیرا ہے۔ چلو باہر یکہ کھڑا ہے۔ بیٹھ لو۔ ادھر ہی سے صاحب کے بنگلے پر ہوتے ہوئے چلیں گے۔ جو کچھ وہ کہیں لکھ دینا۔ بات ہی کونسی ہے۔ ہمیں کونسی لڑائی کرنی ہے۔ کل ہی سے دوڑ دھوپ کر رہا ہوں۔ بارے آج دوپہر کو جا کر سیدھا ہوا۔ پہلے بہت یوں توں کرتا رہا، لیکن میں نے بھی پنڈ نہ چھوڑا۔ اگر وہاں نہ چلنا چاہو تو یہیں ایک خلف نامہ لکھ دو۔ دیر کرنے سے کیا فائدہ، تمہاری اماں رو رو کر جان دے رہی ہیں۔''

چکر دھر نے سر نیچا کر کے کہا۔ ''ابھی تو میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ سوچ کر جواب دوں گا۔''

بجر دھر: کیسی باتیں کرتے ہو بیٹا۔ یہاں ناک کٹی جا رہی ہے۔ گھر سے باہر نکلنا مشکل

ہو رہا ہے۔ اور تم کہتے ہو سوچ کر جواب دوں گا۔ اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ چلو حلف نامہ لکھ دو۔ گھر میں کل سے آگ نہیں جلی۔

چکر دھر: میرا دل کسی طرح اپنے پاؤں میں بیڑیاں ڈالنے پر راضی نہیں ہوتا۔

چکر دھر جب خلف نامہ پر دستخط کرنے پر راضی نہ ہوئے تو منشی جی مایوس ہو کر بولے۔

''میں تو جانتا تھا کہ تم میری ایک نہ سنو گے اس لیے آتا نہ تھا۔ لیکن تمہاری ماں نے کرید کرید کر بھیجا ہے۔ کہہ دوں گا نہیں آتا۔ صبر کر کے بیٹھو، اسے اپنی ٹیک اور اپنی شان ماں باپ سے پیاری ہے۔ جتنا رونا ہو رو لو۔''

سخت سے سخت دل میں بھی ماں کی محبت کی پاکیزہ یادگاریں محفوظ ہوتی ہیں۔ چکر دھر نے پس و پیش کر کے کہا۔ ''آپ اماں کو سمجھا دیجیے گا کہ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ میرے لیے رنج نہ کریں۔''

بجر دھر نے دھوپ میں بال سفید نہ کیے تھے۔ تاڑ گئے نشانہ ٹھیک پڑا ہے۔ بے پروائی سے بولے۔ ''مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ بیکار کے لیے جھوٹ بولوں۔ جو آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں وہی کہوں گا۔ روئیں گی۔ روئیں، رونا تو اس کی تقدیر ہی میں لکھا ہے۔ جب سے تم آئے ہو ایک گھونٹ پانی بھی منہ میں نہیں گیا۔ اس طرح دو چار دن رہی تو جان نکل جائے گی۔''

چکر دھر کا دردمند دل بے قرار ہو گیا۔ منشی جی کے ساتھ دفتر کی طرف چلے۔ منشی کے چہرے کی جھریاں ایک لمحہ کے لیے مٹ گئیں۔ چکر دھر کو گلے لگا کر بولے۔

''جیتے رہو بیٹا۔ تم نے میری آبرو رکھ لی۔''

دونوں آدمی دفتر میں آئے تو جیلر نے کہا۔ ''کیا آپ اقرار نامہ لکھ رہے ہیں؟ نکل گئی ساری ہیکڑی۔ اسی پر اتنی دون کی لیتے تھے؟''

چکر دھر پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اپنی کمزوری پر شرمندہ ہوئے۔ قوم کے خادموں کو دنیا اصولوں پر قربان ہوتے دیکھنا چاہتی ہے۔ قومیت کے دائرے میں آتے ہی اس کے

اوصاف کی جانچ بڑی سختی سے اور عیبوں کی بڑی فراخ دلی سے ہونے لگتی ہے۔ انتہا درجہ کا بے اصول آدمی بھی درویشوں سے اونچے معیار پر چلنے کی امید رکھتا ہے اور انہیں معیار سے گرتے دیکھ کر مذمت کرنے میں مطلق پس وپیش نہیں کرتا۔ جیلر کے پر معنی سوال نے چکر دھر کو بیدار کر دیا۔ بولے۔ ''میں ذرا وہ خلف نامہ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''اس میں کچھ نہیں ہے۔ جو باتیں تم سے کہہ چکا ہوں وہی ذرا قانونی پیرائے میں لکھ دی گئی ہیں۔''

چکر دھر نے کاغذ کو سرسری طور پر دیکھ کر کہا۔ ''اس میں تو میرے لیے کوئی گنجائش ہی نہ رہی۔ گھر پر قیدی بنا بیٹھا رہوں گا۔ اپنے ہاتھوں اپنے پاؤں میں بیڑیاں نہ ڈالوں گا۔ جب قیدی ہی ہونا ہے تو جیل خانہ ہی کیا برا ہے۔ اب یا تو عدالت سے بری ہو کر آؤں گا یا سزا کے دن کاٹ کر۔'' یہ کہہ کر چکر دھر اپنی کوٹھری میں چلے گے۔

ایک ہفتہ بعد مجسٹریٹ کے اجلاس میں مقدمہ چلنے لگا۔

عدالت میں روز خاصی بھیڑ ہو جاتی تھی۔ وہ سب مزدور جنہوں نے ہڑتال کی تھی ایک بار چکر دھر کے درشنوں کو آ جاتے۔ شہر سے بھی ہزاروں آدمی آ پہنچے تھے۔ کبھی کبھی راجہ بشال سنگھ بھی آ جاتے، لیکن اور کوئی آئے یا نہ آئے، جلد آئے یا دیر میں آئے۔ مگر منورما دس بجے بلا ناغہ کچہری میں آ جاتی تھی۔ اور عدالت کے برخاست ہونے تک اپنی جگہ بیٹھی رہتی۔ اس کے چہرے پر اب وہ پہلے کی سی سرخی، وہ رونق، وہ شگفتگی نہیں ہے۔ وہ نہ کسی سے بولتی ہے نہ ملتی ہے۔ اسے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ وہی خوش طبع نازنین ہے جس کی ہنسی دلوں کو تازہ کر دیتی تھی۔

شام کا وقت تھا۔ پندرہ پیشیوں کے بعد آج مجسٹریٹ نے چکر دھر کو دو سال قید سخت کی سزا دی تھی۔ یہ کم سے کم سزا تھی جو ایسے جرم میں دی جا سکتی تھی۔ چکر دھر ہنس ہنس کر دوستوں سے رخصت ہو رہے تھے۔ مزدوروں کا ہجوم عدالت کے دروازے پر کھڑا جے جے کار کا شور مچا رہا تھا۔ کئی عورتیں کھڑی رو رہی تھیں۔ یکا یک منورما آ کر چکر دھر کے

سامنے کھڑی ہوگئی۔اس کے ہاتھ میں پھولوں کا ایک ہار تھا۔وہ اس نے ان کے گلے میں ڈال دیا اور بولی۔

''بابو جی۔عدالت نے آپ کو سزا دے دی، پر اتنے آدمیوں میں یہاں ایک بھی ایسا نہ ہوگا جس کے دل میں آپ کی عزت سو گنا نہ ہوگئی ہو۔آپ نے ہمیں سچی جرأت، سچی اصول پروری اور سچے فرض کا راستہ دکھا دیا۔جس کام کا بیڑا اٹھایا اسے پورا کیجیے۔ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔''

چکر دھر نے صرف دبی آنکھوں سے منورما کو دیکھا، کچھ بول نہ سکے۔انہیں شرم آ رہی تھی کہ لوگ دل میں کیا خیال کر رہے ہوں گے۔سامنے راجہ صاحب، دیوان صاحب، گرسیوک سنگھ اور منشی بجر دھر کھڑے تھے۔برآمدے میں ہزاروں آدمیوں کی بھیڑ تھی۔ شکریہ کے الفاظ چکر دھر کی زبان پر آ کر رک گئے۔وہ دکھانا چاہتے تھے کہ منورما کی یہ عقیدت محض طفلانہ حرکت ہے۔

دوسرے ہی لمحہ میں سپاہیوں نے چکر دھر کو بند گاڑی میں بٹھا دیا اور جیل کی طرف لے چلے۔

بارہ

چکر دھر کی گرفتاری کے دوسرے روز منورما، راجہ بشال سنگھ کو پھٹکار سنانے آئی تھی۔ اس کی دونوں آنکھیں بیر بوٹی ہو رہی تھیں اور بھویں چڑھی ہوئی تھیں۔اس وقت راجہ صاحب کوپ بھون میں مارے غصہ کے اپنی مونچھیں اینٹھ رہے تھے۔سارے راج محل میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔منورما ان کے سامنے چلی گئی اور انہیں حقارت آمیز نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔''مہاراج میں آپ سے یہ پوچھنے آئی ہوں کہ ثروت اور حیوانیات ایک ہی چیز ہے یا ان میں کچھ فرق ہے؟ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ جنھیں میں اپنا دیوتا سمجھتی ہوں ان پر آپ کے ہاتھ کیونکر اٹھے؟''

راجہ صاحب اسے دیکھ کر چونک پڑے۔کوئی دوسرا ہوتا تو شاید جھلا پڑتے۔پر منورما

کے پرتمکنت حسن نے انہیں مغلوب کر دیا۔ کھولتے ہوئے پانی نے دہکتے ہوئے شعلوں کو فرو کر دیا۔ انہوں نے معذرت کا انداز سے کہا۔ ''منورما۔ میرے دل میں بابو چکر دھر کی جتنی عزت تھی اور ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ میں نے ان کے ساتھ جو ظلم کیا ہے اس کا افسوس مجھے زندگی بھر رہے گا۔''

منورما کا غصہ غائب ہو گیا۔ بولی۔ ''محض افسوس کرنے تو وہ زخم نہ بھرے گا۔''

راجہ نے دردناک لہجہ میں کہا۔ ''میں بڑا بدنصیب ہوں منورما۔ میرے دل میں بڑے بڑے حوصلے تھے۔ پر اتفاقات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ میرے ہاتھوں وہ سب کچھ ہو رہا ہے جس سے مجھے نفرت تھی۔ نہ جانے وہ کوئی طاقت ہے جو مجھے اپنے ضمیر کے خلاف لیے جا رہی ہے۔ میرے پاس کوئی ایسا مشیر نہیں ہے جو مجھے سچی صلاح دے۔ اتنے آدمیوں کے بیچ میں تنہا، بیزار اور بے کس آدمی ہوں۔ میں اسی وقت مجسٹریٹ کے پاس جاؤں گا۔''

راجہ صاحب کے اس انکسار اور دل جوئی نے منورما کو بھی متاثر کر دیا۔ بولی۔ ''مگر جب آپ کو اس سے کوئی امید نہیں تو بے فائدہ کیوں تکلیف اٹھائیے گا۔ میں نے آپ کا اتنا وقت ضائع کیا۔ اس کے لیے مجھے معاف کیجیے گا۔''

یہ کہتی ہوئی منورما کمرے سے چلی گئی۔ بشال سنگھ دروازہ پر کھڑے اس کی طرف تشنہ کام نظروں سے تاکتے رہے۔ جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ تب ایک ٹھنڈی سانس لے کر کرسی پر لیٹ گئے۔ ان کے دل میں آج ایک نئی تمنا رونما رہی تھی۔

دیوان صاحب سے پہلے وہ کھنچے کھنچے رہتے تھے۔ اب ان کی قدر و منزلت کرنے لگے۔ دو تین بار ان کے مکان پر بھی گئے اور اپنی شرافت کا سکہ جما آئے۔ ٹھاکر صاحب کی بھی کئی بار دعوت کی۔ ارتباط بڑھنے لگا۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ منورما کی شادی کی بات چیت اور کہیں نہیں ہوئی تھی۔ میدان صاف تھا۔ ان موقعوں پر منورما ان سے کچھ اس طرح دل کھول کر ملی کہ راجہ صاحب کی امیدیں اور بھی روشن ہو گئیں۔ اگر کچھ شبہ تھا تو وہ لونگی کی

طرف سے تھا۔ وہ راجہ صاحب کا آنا جانا پسند نہ کرتی تھی۔ وہ ان کے ارادوں کو بھانپ گئی تھی۔ اور انہیں دور ہی رکھنا چاہتی تھی۔ یہی ایک کانٹا تھا اور اسے ہٹائے بغیر وہ منزل مقصود پر نہ پہنچ سکتے تھے۔ آخر انہوں نے منشی جی کو اپنا راز دار بنانے کا فیصلہ کیا۔

دوسرے روز علی الصبح منشی جی دیوان کے مکان پر پہنچے۔ دیوان صاحب منورما کے ساتھ گنگا اشنان کرنے گئے ہوئے تھے۔ لونگی اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ منشی جی پھولے نہ سمائے۔ ایسا ہی موقع چاہتے تھے۔ جاتے ہی جاتے شادی کی ذکر چھیڑ دیا۔

لونگی کو یہ رشتہ سی طور منظور نہ تھا۔ ابھی بات چیت ہو رہی تھی کہ دیوان صاحب اشنان کر کے لوٹ آئے۔ لونگی نے اشارے سے انہیں تنہائی میں بلایا اور اپنے کمرے میں لے جا کر بولی۔

''راجہ صاحب نے منورما سے بیاہ کا سندیسہ بھیجا ہے۔''

ٹھاکر صاحب کے دل میں گدگدی ہونے لگی۔ پوچھا۔ ''تمہاری کیا صلاح ہے؟''

''جو تمہاری مرضی ہو کرو۔ میری صلاح کیا پوچھتے ہو؟''

''یہی میری بات کا جواب ہے؟''

''میری بات مانو گے تو نہیں۔ پوچھنے سے فائدہ؟''

''کوئی بات بتا دو جو میں نے تمہاری مرضی کے خلاف کی ہو۔''

''میری مرضی سے کوئی بات نہیں ہوتی۔ میں کہتی ہوں۔ مجھے یہ بیاہ ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ مانتے ہو؟''

''ہاں مانتا ہوں جا کر منشی جی سے کہے دیتا ہوں۔''

''اگر راجہ صاحب برا مان جائیں تو؟''

''کچھ پروا نہیں۔ نوکری جاتی رہے تو بھی کچھ پروا نہیں۔ کیا تم مجھے بالکل ہی گیا گزرا سمجھتی ہو؟ میں ذرا جھگڑے سے بچتا ہوں تو تم نے سمجھ لیا کہ ان میں کچھ دم نہیں ہے۔ پرزے اڑ جائیں لیکن بشال سنگھ سے لڑکی کی شادی نہ کروں گا۔ تم نے سمجھا کیا ہے؟''

دیوان صاحب اسی جوش میں اٹھے اور جا کر منشی جی سے بولے۔ ''آپ جا کر راجہ صاحب سے کہہ دیجیے کہ ہمیں شادی منظور نہیں۔''

منشی جی مایوس ہو کر لوٹے۔ راستے میں سوچا اگر راجہ صاحب کو کہہ دیتا ہوں کہ دیوان صاحب نے صاف انکار کر دیا تو میری کرکری ہوتی ہے۔ اس لیے اگر کچھ ایسی گول مول باتیں کروں کہ اپنا وقار بھی قائم رہے اور راجہ صاحب بھی خوش ہو جائیں۔ جا کر بولے۔

''حضور بڑھیا بڑی چڑیل ہے۔ ادھر بھی جھکتی ہے ادھر بھی اور دیوان صاحب تو نرے مٹی کے ڈھیلے ہیں۔''

راجہ صاحب نے بے صبر ہو کر پوچھا۔ ''آخر آپ کیا طے کر آئے؟''

منشی جی: حضور کے اقبال کی فتح ہوئی۔ میں نے موقع پا کر منورما سے تذکرہ کر دیا، سن کر بہت خوش ہوئی۔ دیوان صاحب خود آپ سے شادی کی بات چیت کرتے شرماتے ہیں۔ آپ کی طرف سے بات چیت شروع ہو تو شاید انہیں انکار نہ ہو۔

راجہ صاحب: تو میں آج ہی بات چیت شروع کرتا ہوں۔ آج ٹھاکر صاحب کی دعوت کروں گا اور منورما کو بھی بلاؤں گا۔ آپ بھی آ جائیے گا۔

دعوت میں راجہ صاحب نے موقع پر کر منورما کے سامنے اپنے دل کا حال کھول کا رکھ دیا۔ پہلے تو وہ سہمی کھڑی رہی۔ پھر بولی۔ ''پتا جی سے آپ کی بات چیت تو ابھی نہیں ہوئی۔''

راجہ صاحب: ابھی تو نہیں، مگر موقع دیکھتے ہی کروں گا۔ پر کہیں انہوں نے انکار کر دیا تو؟''

منورما: میری قسمت کا فیصلہ وہی کر سکتے ہیں۔ ان کا یہ حق میں نہیں چھینوں گی۔

دونوں برآمدے میں پہنچے تو منشی جی اور دیوان صاحب کھڑے تھے۔ منشی جی نے راجہ صاحب کو دیکھتے ہی اچھل کر کہا۔

''مبارک باد دیتا ہوں۔ آج جشن ہونا چاہیے (منورما سے) مہارانی آپ کا سہاگ

سدا سلامت رہے۔''

دیوان صاحب سٹپٹا کر بولے۔''ذرا مجھے گھر میں.....''

منشی جی بے بات چھین لی۔''جناب کار خیر میں پس و پیش کی ضرورت نہیں۔ دعا دیجیے جوڑی سلامت رہے۔''

یکا یک باغ میں بینڈ بجنے لگا اور راجہ کے کارکنان کا ہجوم ادھر ادھر سے آ کر مبارکباد دینے لگا۔ دیوان صاحب کی آنکھوں کے سامنے ان کا گھر لٹا جاتا تھا۔ پر زبان کھولنے کا موقع نہ تھا۔ سر جھکائے حواس باختہ کھڑے تھے۔ نہ کچھ کہتے بنتا تھا نہ سنتے۔ دل میں منشی جی کو ہزاروں گالیاں دے رہے تھے۔ میرے ہی ساتھ یہ ہتھکنڈے! لونگی کے سامنے کون سا منہ لے کر جاؤں۔ آخر یہ کہہ کر دل کو سمجھایا کہ لونگی سے سب حال کہہ دوں گا۔ قسمت میں یہی لکھا تھا تو میں کیا کرتا۔ منورما بھی تو خوش ہے۔

ٹھاکر صاحب گھر پہنچے۔ ابھی کپڑے اتار ہی رہے تھے کہ لونگی نے آ کر پوچھا۔

''وہاں کیا بات چیت ہوئی؟''

دیوان صاحب نے کہا۔''شادی طے ہوگئی اور کیا۔''

یہ سن کر لونگی نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اسے دیوان صاحب پر بہت غصہ آیا۔ انہیں خوب کھری کھری سنائیں۔ منشی جی کی بھی سات پشتوں کی خبر لے ڈالی، لیکن شادی تو طے ہوگئی تھی۔ اب انکار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے لونگی من مار کر اسی روز سے شادی کی تیاریاں کرنے لگی۔

اسی طرح تین مہینے گزر گئے۔ شادی کے دن قریب آ گئے۔ اچانک ایک روز خبر ملی کہ جیل میں ہنگامہ ہو گیا ہے اور چکر دھر کے کندھے پر گہرا زخم لگا ہے۔ بچنا مشکل ہے۔

منورما کے بیاہ کی تیاریاں ہو ہی رہی تھیں اور یوں دیکھنے میں وہ خوش نظر آتی تھی، پر اس کا دل ہمیشہ روتا رہتا تھا۔ ایک موہوم دہشت، ایک ناکام آرزو، ایک ناقابل بیان حسرت ہمیشہ اس کے دل کو چھوٹا کرتی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کا ایک مقصد دل میں قرار

دے رکھا تھا اور اسی پر قناعت کرنا چاہتی تھی، لیکن کبھی کبھی وہ زندگی تاریک، اتنی ویران معلوم ہوتی کہ گھنٹوں ایک بے خودی کی حالت میں بیٹھی رہتی۔ گویا کہیں کچھ نہیں ہے۔ اس فضا میں صرف وہی اکیلی ہے۔

یہ وحشت ناک خبر پاتے ہی وہ گھبرائی ہوئی جا کر لونگی سے بولی۔ ''اماں میں کیا کروں، بابو جی کو دیکھے بغیر اب تو نہیں رہا جاتا۔ کیوں اماں زخم تو اچھا ہو جائے گا نا؟''

لونگی نے دردناک آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ ''اچھا کیوں نہ ہوگا۔ بیٹی! بھگوان چاہیں گے تو بہت جلد اچھا ہو جائے گا۔''

لونگی سے منورما کا راز دل پوشیدہ نہ تھا۔ اس نے سوچا اس غریب کو کتنا صدمہ ہے، دل مسوس کر رہ گئی۔ ہائے دانے پر گرنے والی چڑیا کو موتی چگانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تڑپ تڑپ کر پنجرے میں مر جانے کے سوا اور وہ کیا کرے گی۔ موتی چمکدار ہے۔ انمول ہے، لیکن اسے کوئی کھا تو نہیں سکتا۔

تیرہ

چکر دھر کو جیل میں پہنچنے پر ایسا معلوم ہوا کہ ایک نئی دنیا میں آ گئے ہوں۔ جس کا خالق انسان ہے، لیکن انسان کے رچے ہوئے سنسار میں انسانیت کا اتنا خون ہو سکتا ہے اس کا انہیں قیاس بھی نہ تھا۔ کھانا اتنا خراب کہ شاید کتے بھی سونگھ کر چھوڑ دیں۔ کپڑے ایسے خراب کہ بھکاری بھی نہ پہنے اور محنت اتنی زیادہ کہ بیل بھی نہ کر سکے۔ جیل کوئی سدھار کا محکمہ نہیں۔ یہاں کا سارا طرز عمل شرمناک، نفرت انگیز اور وحشیانہ ہے۔

چکر دھر کو چکی پیسنے کی خدمت سپرد ہوئی تھی۔ صبح سے شام تک چکی میں جتے رہنا پڑتا۔ صرف دوپہر کو کھانے کی چھٹی ملتی تھی۔ وہ ہمیشہ احتیاط رکھتے کہ عملہ کو کچھ کہنے کا موقع نہ ملے، لیکن گالیوں میں باتیں کرنا ہی جن کا شعار ہو گیا ہو ان سے بچنا محال تھا، لیکن یہاں تک مصیبت کا خاتمہ نہ تھا۔ ان کے کمرہ میں پانچ قیدی اور تھے۔ وہ سب ان پر گندے، حیا سوز آوازے کستے کہ غصہ اور نفرت سے ان کا خون جوش کھانے لگتا۔ پر لہو کے گھونٹ

پی کر رہ جاتے۔ ان پانچوں میں ایک دھنا سنگھ نام کا ایک ٹھاکر بھی تھا۔ نہایت شہ زور، غضب کا خونخوار۔ وہی ان کا سرغنہ تھا۔ وہ سب اتنی بدزبانیاں کرتے، ایسے فحش کلمات کہتے کہ چکر دھر کو کانوں میں انگلیاں ڈالنی پڑتیں۔ حکم تو یہ تھا کہ کوئی قیدی تمباکو بھی نہ پینے پائے۔ مگر وہاں گانجہ، بھنگ، شراب، افیون یہاں تک کہ کوکین بھی نہ جانے کس تگڑم سے پہنچ جاتی تھی۔ نشے میں وہ سب اتنے بےخود ہو جاتے گویا انسان کی صورت میں شیطان ہوں۔

رفتہ رفتہ چکر دھر کو ان آدمیوں سے ہمدردی ہونے لگی۔ سوچا اس فضا میں آ کر ایسا کون انسان ہے جو انسانیت کے درجہ سے گر نہ جائے۔ انہیں سبھی درجہ کے آدمیوں سے ملنے کا سابقہ پڑ چکا تھا۔ پر ایسے بےشرم گالیاں کھا کر ہنسنے والے بےحیا اب تک انہوں نے نہ دیکھے تھے۔ پہلے وہ ان سے احتراز کرتے تھے ان سے کنارہ کش رہتے تھے، لیکن اب ان کی حالت پر انہیں رحم آتا تھا۔ کوئی قیدی انہیں گالیاں دے دیتا تو چپ ہو جاتے اور اس تاک میں رہتے کہ کب اس کے ساتھ شرافت کے اظہار کا موقع ملے۔

چکر دھر کی زندگی میں روحانیت کو کبھی اتنا دخل نہ تھا۔ ان کے اطوار کبھی اتنے پاکیزہ نہ تھے جب بھی موقع ملتا تو وہ قیدیوں کو مذہبی روائتیں سناتے۔ قیدیوں کو ان کی تمثیلوں میں اتنا لطف آتا کہ گویا ان کا ایک ایک لفظ ان کے لوح دل پر رقم ہوتا جاتا تھا۔

اسی طرح کئی مہینے گزر گئے۔ ایک دن شام کے وقت چکر دھر دن بھر کی محنت شاقہ کے بعد بیٹھے ہوئے تھے کہ کئی قیدی آپس میں باتیں کرتے ہوئے آ نکلے۔ ''آج اس داروغہ کی خبر لینی چاہیے۔ جب دیکھو گالیاں دیا کرتا ہے۔ ایسا مارو کہ عمر بھر کے لیے یاد ہو جائے۔ یہی نہ ہوگا۔ سال دو سال کی میعاد اور بڑھ جائے گی۔'' چکر دھر اس طرح کے چرچے اکثر سنتے رہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اس پر کچھ خاص دھیان نہ دیا۔ مگر کھانے کے وقت جیوں ہی داروغہ صاحب آ کر کھڑے ہوئے اور قیدی کو دیر میں آنے کے باعث مارنے دوڑے کہ کئی قیدی چاروں طرف سے دوڑ پڑے اور انہیں چاروں طرف سے گھیر

لیا، مارو مارو کا شور مچ گیا۔ داروغہ صاحب بدحواس ہو گئے۔ دفعتاً دھنا سنگھ نے آگے بڑھ کر ان کی گردن پکڑی اور اتنی زور سے دبائی کہ ان کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ چکر دھر نے دیکھا، غضب ہوا جاتا ہے تو تیر کی طرح جھپٹے۔ قیدیوں کے بیچ میں گھس کر دھنا سنگھ کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولے۔

''کیا کرتے ہو ہٹ جاؤ''۔

''ہٹ جاؤ سامنے سے نہیں تو سارا بابو پن نکال دوں گا۔ پہلے اس سے پوچھو۔ اب تو کسی کو گالیاں نہیں دے گا۔ مارنے تو نہیں دوڑے گا؟''

داروغہ: قسم قرآن کی۔ جواب کبھی میری زبان سے گالی کا ایک حرف بھی نکلے۔

دھنا سنگھ: کان پکڑو۔

داروغہ نے کان پکڑے۔

دھنا سنگھ: جاؤ بچہ بھلے کا منہ دیکھ کر اٹھے تھے۔ نہیں تو آج جان نہ بچتی۔ یہاں کون رونے والا بیٹھا ہے۔

چکر دھر: داروغہ جی خدا کے لیے اس معاملے کو طول نہ دیجیے گا۔

داروغہ: لاحول ولاقوۃ۔ اتنا کمینہ نہیں ہوں۔

داروغہ جی یہاں سے جان بچا کر بھاگے، لیکن دفتر میں جاتے ہی گارڈ کے سپاہیوں کو للکارا۔ حاکم ضلع کو ٹیلیفون کیا اور خود بندوق لے کر جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ دم کے دم میں سپاہیوں کی جماعت سنگینیں چڑھائے آ پہنچی اور داروغہ جی بھی دوڑے پڑے۔

چکر دھر پر چاروں طرف سے بوچھاریں پڑنے لگیں۔ انہوں نے آگے بڑھ کر داروغہ سے پوچھا۔ ''آخر آپ چاہتے کیا ہیں۔ ان غریبوں کو کیوں گھیر رکھا ہے؟''

داروغہ نے سپاہیوں کی آڑ سے کہا۔ ''یہی ان سب بدمعاشوں کا سرغنہ ہے۔ اسے گرفتار کر لو اور باقی سب جتنے ہیں انہیں خوب مارو۔''

''آپ کو قیدیوں کا مارنے کا کوئی حق نہیں ہے۔'' چکر دھر نے داروغہ سے کہا۔

سپاہی قیدیوں پر ٹوٹ پڑے اور انہیں بندوقوں کے کندوں سے مارنا شروع ہو گئے۔

قیدیوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ کچھ تو جان لے کر بھاگے۔ کچھ ادھر ادھر سے پھاوڑے کدالیں، پتھر لا لا کر لڑنے کو تیار ہو گئے۔ موقع نازک تھا۔ چکر دھر نے بڑی عاجزی کے ساتھ داروغہ سے کہا۔

''میں آپ کو پھر سمجھاتا ہوں۔''

''چپ رہ سور کا بچہ۔'' داروغہ نے بڑی رعونت سے جواب دیا۔

اتنا سننا تھا کہ چکر دھر باز کی طرح داروغہ جی پر جھپٹے لیکن فوراً ہی انہیں خیال آ گیا کہ حالت اور بھی نازک ہو جائے گی۔ ابھی سپاہی بندوقیں چلانا شروع کر دیں گے اور لاشوں کے ڈھیر لگ جائیں گے۔ وہ قیدیوں سے للکار کر بولے۔

''پتھر نہ پھینکو۔ پھر نہ پھینکو۔ سپاہیوں کے ہاتھ سے بندوقیں چھین لو۔''

سپاہیوں پر دس دس قیدی ٹوٹ پڑے اور دم کے دم میں ان کی بندوقیں چھین لیں۔ یہ سب کچھ پانچ منٹ میں ہو گیا۔ داروغہ کی شکل دیکھنے کے قابل تھی۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ تھر تھر کانپ رہے تھے۔

قیدیوں نے دیکھا اس وقت اپنا راج ہے تو پرانے بدلے چکانے پر تیار ہو گئے۔

دھنا سنگھ لپکا ہوا داروغہ کے پاس آیا اور زور سے ایک دھکا دے کر بولا۔

''کیوں خاں صاحب اکھاڑ لوں داڑھی کا ایک ایک بال۔''

چکر دھر: دھنا سنگھ! ہٹ جاؤ۔

دھنا: مرنا تو ہے ہی۔ اب اسے کیوں چھوڑیں؟

چکر دھر: میرے دیکھتے تو ان پر آنچ نہ آئے گی۔ ہاں مر جاؤں تو جو چاہے کرنا۔

دھنا: اگر ایسے ہی بڑے دھرماتما ہو تو انہیں کیوں نہیں سمجھاتے؟

اتنے میں صدر پھاٹک پر شور ہوا۔ حاکم ضلع مسٹر جم مسلح پولیس افسروں اور جوانوں کے ساتھ آ پہنچے تھے۔ داروغہ نے اندر آتے وقت صدر دروازے کے قفل کی کنجی اپنی جیب

میں ڈال لی تھی۔ تا کہ کوئی قیدی بھاگنے نہ پائے۔ یہ شور سنتے ہی چکر دھر سمجھ گئے کہ پولیس آ گئی۔ بولے۔

''ارے بھائی کیوں اپنی جان کے دشمن بنے ہو۔ بندوقیں رکھ دو اور فوراً جا کر دروازہ کھول دو پولیس آ گئی۔''

دھنا: کوئی فکر نہیں۔ ہم بھی لوگوں کا دار تیار کیے دیتے ہیں۔ مرنا تو ہے ہی تو دو چار کو مار کر مریں گے۔

قیدیوں نے فوراً سنگینیں چڑھا لیں اور سب سے پہلے دھنا سنگھ داروغہ جی پر جھپٹا۔ قریب تھا کہ سنگین کی نوک داروغہ کے خون سے اپنی زبان تر کرے کہ چکر دھر وہاں بائیں کرتے ہوئے داروغہ کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ دھنا سنگھ وار کر چکا تھا۔ چکر دھر کے کندھے پر سنگین کا بھرپور ہاتھ پڑا۔ خون کا فوارہ نکل پڑا۔ چکر دھر کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ داہنے ہاتھ سے کندھے کو پکڑ کر بیٹھ گئے۔ قیدیوں نے انہیں گرتے دیکھا تو ہوش اڑ گئے۔ آ، آ کر چکر دھر کے چاروں طرف کھڑے ہو گئے۔ بھگت جی اب نہ بچیں گے۔ یہ خیال ان کے شیطانی جنون پر غالب آ گیا۔ دھنا سنگھ نے بندوق پھینک دی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ پشیمانی کے جذبے سے بےخود ہو کر وہ زور مار رہا تھا کہ اپنے ہاتھ قیدیوں کے ہاتھوں سے چھڑا کر وہی سنگینیں اپنے سینے میں چبھا لے، لیکن قیدیوں نے اتنے زور سے پکڑ رکھا تھا کہ اس کا کچھ بس نہ چلتا تھا۔

داروغہ نے موقع پایا تو صدر دروازے کی طرف دوڑے۔ دھنا سنگھ نے دیکھا کہ وہی ذات شریف جو سارے فساد کے بانی ہیں بےداغ بچے جاتے ہیں تو اس کے جوش انتقام نے اتنا زور مارا کہ ایک ہی جھٹکے میں قیدیوں کے ہاتھوں سے آزاد ہو گئے اور بندوق اٹھا کر ان کے پیچھے دوڑا۔ قریب تھا کہ داروغہ پر پھر وار پڑے کہ چکر دھر پھر سنبھل کر اٹھے اور ایک ہاتھ سے اپنا کندھا پکڑے لڑکھڑاتے ہوئے چلے۔ دھنا سنگھ نے انہیں آتے دیکھا تو اس کے قدم رک گئے۔ بھگت جی ابھی زندہ ہیں۔ اس کو اس کی اتنی خوشی ہوئی کہ وہ

بندوق پھینک کر پیچھے کی طرف چلا اور ان کے پیروں پر سر رکھ کر رونے لگا۔ ایسی سچی خوشی اسے اپنی زندگی میں کبھی نہ ہوئی تھی۔

چکر دھر نے کہا۔ ''گارڈ والوں کو چھوڑ دو۔''

دھنا سنگھ نے کہا۔ ''بہت اچھا بھیا۔ تمہارا جی کیسا ہے؟''

یکا یک مسٹر جم مسلح پولیس کے ساتھ جیل میں داخل ہوئے۔ انہیں دیکھتے ہی سارے قیدی جان لے کر بھاگے۔ صرف دو آدمی چکر دھر کے ساتھ کھڑے رہے۔ دھنا سنگھ ان میں سے ایک تھا۔ گارڈ والوں نے بھی چھوٹتے ہی اپنی اپنی بندوقیں سنبھالیں۔ اور ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔

مسٹر جم نے پوچھا۔ ''ویل (Well) داروغہ کا کیا حال ہے؟''

داروغہ: حضور کے اقبال سے فتح ہوئی۔

جم: یہ کون آدمی پڑا ہے؟

داروغہ: اسی نے تو ہم لوگوں کی مدد کی ہے حضور! چکر دھر نام ہے۔

جم: اچھا یہ وہی چکر دھر ہے۔ جس نے راجہ صاحب کے آدمیوں کو بھڑکایا تھا۔

داروغہ: جی ہاں حضور، یہ وہی چکر دھر ہے۔ آج تو اسی کی بدولت ہم لوگوں کی جانیں بچیں۔ جو زخم اس کے کندھے میں ہے۔ وہ اس وقت میرے سینے میں ہوتا۔

جم: اسی نے قیدیوں کو بھڑکایا ہوگا؟

داروغہ: نہیں حضور۔ اس نے تو قیدیوں کو سمجھا کر ٹھنڈا کیا۔

جم: تم کچھ نہیں سمجھتا۔ یہ لوگ پہلے قیدیوں کو بھڑکاتا ہے۔ پھر ان کی طرف سے حکام سے لڑتا ہے۔

داروغہ: دیکھنے میں تو حضور بہت سیدھا نظر آتا ہے۔ دل کا حال خدا جانے۔

جم: خدا کے جاننے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تم کو جاننا چاہیے۔ یہ آدمی قیدیوں سے مذہب کی بات چیت تو نہیں کرتا؟

داروغہ: مذہبی باتیں تو بہت کرتا ہے۔ حضور۔ یہاں بھگت مشہور ہے۔

جم: اوہ۔ تب تو یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ مذہب والے آدمیوں سے بہت ہوشیار رہنا چاہیے۔ جب کوئی پڑھا لکھا آدمی مذہب کی بات کرے تو فوراً سمجھ لو کہ وہ کچھ گول مال کرنا چاہتا ہے۔ وہ قیدیوں کے ساتھ بہت ہمدردی کرتا ہوگا؟

داروغہ: جی ہاں۔

جم: سرکاری احکام خوب مانتا ہوگا؟

داروغہ: جی ہاں۔ ہمیشہ۔

جم: کبھی شکایت نہ کرتا ہوگا۔

داروغہ: جی نہیں کبھی شکایت نہیں کرتا۔ ایسا بے زبان آدمی تو ہم نے دیکھا ہی نہیں۔

جم: ایسا آدمی نہایت خوفناک ہوتا ہے۔ اس پر کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ سپاہیوں کو دفتر میں بلائیے ہم ان کے بیان لکھیں گے۔

داروغہ: حضور۔ پہلے اسے ڈاکٹر صاحب کو تو دکھا دوں۔ ایسا نہ ہو کہ مر جائے۔

جم: وہ مرے گا نہیں۔ ایسا خوفناک آدمی کبھی نہیں مرتا۔ اور مر بھی جائے تو ہمارا کوئی نقصان نہیں۔

یہ کہہ کر مسٹر جم دفتر کی طرف چلے۔ دھنا سنگھ اب تک انتظار میں کھڑا تھا کہ ڈاکٹر صاحب آتے ہوں گے۔ جب دیکھا کہ جم صاحب ادھر مخاطب بھی نہ ہوئے تو اس نے چکر دھر کو گود میں اٹھا لیا اور ہسپتال لے چلا۔

چکر دھر کئی مہینے جیل کے ہسپتال میں پڑے رہے۔ معالجہ کا تو کیا اثر ہوتا۔ وہاں غریبوں کی دعاؤں کا اثر ضرور ہوا۔ شاید منورما کے پوجا پاٹھ کا بھی کچھ اثر ہوا ہو۔ جن باتوں کو پہلے وہ ڈھکوسلہ سمجھتی تھی۔ انہی باتوں سے اب اس کی روحانی تشفی ہوتی تھی۔ کمزوری ہی میں ہم لکڑی کا سہارا لیتے ہیں۔

چکر دھر تو ہسپتال میں پڑے تھے ادھر ان پر نیا مقدمہ چلانے کی تیاری ہو رہی تھی۔

جیوں ہی وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوئے۔ استغاثہ دائر ہو گیا۔ ٹھاکر گرسیوک سنگھ آج کل ڈپٹی مجسٹریٹ تھے۔ انہی کے سپرد یہ مقدمہ کیا گیا۔ جیل کے اندر ہی اجلاس ہونے لگا۔

ٹھاکر صاحب کسی معاملے میں کوئی رو رعایت نہ کرتے تھے۔ پر اس مقدمہ نے انہیں شش و پنج میں ڈال دیا۔ دھنا سنگھ اور دوسرے ملزموں کی طرف سے تو کوئی اندیشہ نہ تھا۔ پر چکر دھر کا کیا کریں؟ اگر سزا دیتے ہیں تو رسوائی ہوتی ہے۔ منورما تو شاید ان کا منہ بھی نہ دیکھے۔ چھوڑتے ہیں تو اپنی برادری میں بدنام ہوتے ہیں، کیونکہ وہاں سبھی چکر دھر سے خار کھائے بیٹھے تھے۔

مقدمہ کو پیش ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ گرسیوک سنگھ برآمدے میں بیٹھے ساون کی رم برکھا کا لطف اٹھا رہے تھے کہ اتنے میں منورما موٹر سے اتر کر ان کے قریب کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

گرسیوک نے تاڑ لیا کہ منورما کا آنا علت سے خالی نہیں ہے، پوچھا۔

''کہاں سے آ رہی ہو؟''

''گھر ہی سے آ رہی ہوں۔ جیل والے مقدمہ میں کیا ہو رہا ہے؟''

''ابھی تو گواہوں کے بیان ہو رہے ہیں۔''

''بابو جی پر جرم ثابت ہو گیا؟''

گرسیوک نے افسرانہ ذمہ داری کی شان سے کہا۔ ''میرے لیے جرم کا ثابت ہونا یا نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔ میں چھوڑ دوں تو سرکار اپیل کر کے پھر انہیں سزا دلا دے گی۔ ہاں میں ضرور بدنام ہو جاؤں گا۔''

''تمہارا ضمیر کیا کہتا ہے؟'' منورما نے سوال کیا۔

''میرا ضمیر خاموش ہے۔'' گرسیوک نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''میں تو نہ مانوں گی۔ آپ کا ضمیر کچھ نہ کچھ ضرور کہتا ہو گا۔ خواہ آپ مانیں یا نہ مانیں بابو جی کے لیے سزا کا دو ایک سال بڑھ جانا کوئی بات نہیں۔ وہ بے قصور ہیں اور یہ یقین

انہیں تسکین دینے کے لیے کافی ہے، لیکن تم کہیں کے نہ رہو گے۔''

گرسیوک: چکر دھر بالکل بے قصور نہیں ہیں۔ جیل کے داروغہ پر پہلے وہی دوڑے تھے۔ اس وقت ضبط کر جاتے تو یہ ہنگامہ نہ کھڑا ہوتا۔

منورما: اور میں کہتی ہوں کہ جو کچھ انہوں نے کیا وہی ان کا فرض تھا۔ آپ کو اپنے فیصلہ میں صاف لکھنا چاہیے کہ بابو جی بے قصور ہیں۔ آپ کو سفارش کرنی چاہیے کہ وہ اس خطرناک موقع پر اپنی جان ہتھیلی پر لے کر جیل کے ملازموں کی جان نہ بچاتے تو نتیجہ کہیں زیادہ خطرناک ہوتا۔ ملازموں کی جان بچانے کے عوض ان کی سزا کی میعاد گھٹا دی جائے۔

گرسیوک: تمہارا منشا ہے کہ آگ میں کود پڑوں۔ نوکری کی مجھے پروا نہیں ہے، لیکن جان بوجھ کر زہر نہیں نگلا جاتا۔

منورما: اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ آپ کے افسر آپ سے ناراض ہو جائیں گے تو میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آپ کا کسی طرح کا نقصان نہ ہونے پائے گا۔ میں آپ سے فیصلہ لکھوا کر جاؤں گی۔ لاؤں قلم دوات؟

اتنے میں دوسری موٹر آ پہنچی۔ اس پر راجہ صاحب اترے۔ گرسیوک نے بڑے تپاک سے ان کا استقبال کیا۔ راجہ صاحب نے ان کی طرف کوئی خاص دھیان نہ دیا۔ منورما کے قریب آ کر بولے۔ ''تمہارے گھر سے چلا آ رہا ہوں۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہیں گئی ہیں۔ مگر یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ کہاں، وہاں سے پارک گیا۔ پارک سے چوک گیا۔ سارے زمانے کی خاک چھانتا ہوا یہاں پہنچا ہوں۔ میں کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ گھر سے چلا کرو تو ذرا بتا دیا کرو۔''

یہ کہہ کر راجہ صاحب نے منورما کا ہاتھ آہستہ سے پکڑ لیا اور اسے موٹر کی طرف کھینچا۔

منورما نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا اور چیں بہ جبیں ہو کر بولی۔

''میں نہ جاؤں گی۔''

''آخر کیوں؟''

''اپنی خوشی''

گرسیوک نے رسوخ جتانے کے لیے کہا۔''یہ مجھے سے اس وقت جیل والے مقدمہ کا فیصلہ لکھانے کو بیٹھی ہوئی ہیں۔کہتی ہیں بغیر لکھائے نہ جاؤں گی۔''

گرسیوک نے یہ بات دل لگی میں کہی تھی،مگر منورما کا چہرہ سرخ ہوگیا۔سمجھی کہ یہ مجھے راجہ صاحب کی نگاہوں میں گرانا چاہتے ہیں۔تن کر بولی۔

''ہاں اس لیے بیٹھی ہوں تو پھر؟ آپ کو یہ کہتے ہوئے شرم آنی چاہیے تھی۔اگر میں سمجھتی کہ آپ انصاف سے جو بھر بھی نہ ہٹیں گے تو میرے بیٹھنے کی کیوں ضرورت ہوتی۔ آپ میرے بھائی ہیں۔اس لیے میں آپ کے دروازہ پر دھرنا دے رہی ہوں۔آپ کی جگہ کوئی دوسرا آدمی بابو جی سے جان بوجھ کر بے انصافی کرتا تو اگر میرے بس میں ہوتا تو اس کے ہاتھ کٹوا دیتی۔چکر دھر کی میرے دل میں جتنی عزت ہے اس کا آپ اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔''

ایک لمحہ کے لیے سناٹا چھا گیا۔گرسیوک کا منہ ذرا سا نکل آیا اور راجہ تو جیسے رو دیئے۔ آخر چپ چاپ اپنی موٹر کی طرف چلے۔

چودہ

حکام کے اشاروں پر ناچنے والے گرسیوک سنگھ نے جب چکر دھر کو بری کر دیا تو حکام کے طبقے میں سنسنی پھیل گئی۔گرسیوک سے ایسے فیصلے کی کسی کو امید نہ تھی۔فیصلہ کیا تھا ایک سپاسنامہ تھا۔جس کا ایک ایک لفظ حسن اعتقاد میں ڈوبا ہوا تھا۔شہر میں اس فیصلے کی دھوم مچ گئی۔ایسے انصاف پسند اور نڈر لوگ کم ہی ہوتے ہیں،سب کی زبان پر یہی بات تھی۔ کتنے ہی آدمی گرسیوک کے درشنوں کو آئے۔چکر دھر اس الزام سے بری ہی نہ ہوئے بلکہ ان کی پہلی سزا میں بھی ایک سال کی تخفیف ہوگئی۔مسٹر جم تو ایسا جامے سے باہر ہوئے کہ بس چلتا تو گرسیوک کو گولی مار دیتے اور تو کچھ نہ کر سکے تو تیسرے ہی دن چکر دھر کو

آگے بھیج دیا۔قید کی میعاد تو گھٹا دی گئی لیکن جیل کے ملازموں کو سخت تاکید کر دی گئی کہ کوئی قیدی ان سے بولنے تک نہ پائے۔کوئی ان کے کمرے کے دروازے تک بھی نہ جائے۔ یہاں تک کہ ملازم بھی ان سے نہ بولیں۔سال بھر میں دس سال کی سزا کا مزا چکھانے کی ترکیب سوچ نکالی تھی۔مزا یہ کہ اس دھن میں چکر دھر کو کوئی کام بھی نہ دیا گیا۔بس آٹھوں پہر اسی چار ہاتھ لمبی، تین ہاتھ چوڑی کال کوٹھری میں پڑے رہتے۔

چکر دھر کی کیفیات قلب اتنی جلد جلد تبدیل ہوتی رہتی تھیں کہ کبھی کبھی انہیں اپنے حواس کے صحیح ہونے پر شبہ ہونے لگتا تھا۔کبھی سوچتے خدا نے ایسی دنیا بنائی ہی کیوں۔کیا ایسی دنیا نہ بن سکتی تھی جہاں سبھی انسان، سبھی قومیں خلوص اور ارتباط کے ساتھ دنیا میں رہتیں،نہیں انصاف کے خون سے بھری ہوئی دنیا خدا کی ایجاد نہیں ہوسکتی۔دو چار دن یہی شکوک پیدا ہوتے رہے پھر یکایک تاریکی میں نورانی شعاعیں پھیل جاتیں۔یہ بے دست و پائی ایک فطری نظام کی صورت اختیار کر لیتی۔جس میں حیات اور بیداری روپوش ہے۔ وہ تعلیم گاہ ہے جہاں ہماری مندی ہوئی آنکھیں کھلتی ہیں۔

چکر دھر کے پاس کبھی کبھی ایک بوڑھا وارڈر کھانا لایا کرتا تھا۔بہت ہی زندہ دل آدمی تھا۔اس سے باتیں کرنے کے لیے چکر دھر کتنے مشتاق رہتے تھے۔اس سے انہیں برادرانہ خلوص ہو گیا تھا۔وہ کئی بار پوچھ چکا تھا کہ بابو جی چرس، تمباکو کی خواہش ہو تو ہم سے کہنا۔چکر دھر کو خیال آیا کہ اس سے ایک پنسل اور تھوڑا کاغذ مانگوں۔اپنے جذبات قلم بند کرنے کے لیے ان کا دل بے تاب رہتا تھا۔وہ کئی دن اس پس و پیش میں رہے۔اس سے کہوں یا نہ کہوں۔آخر ایک دن ان سے نہ رہا گیا۔پوچھ ہی بیٹھے۔''کیوں جمعدار یہاں کہیں کاغذ پنسل مل سکیں گے؟''

بوڑھے وارڈر نے ہوشیاری سے جواب دیا۔''ملنے کو تو مل جائیں گے۔پر کسی نے دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟''

اس جواب نے چکر دھر کو سنبھال لیا۔ان کا نفس نیک جو ذرا دیر کے لیے ترغیب میں

پڑ گیا تھا، بیدار ہو گیا۔ بولے۔ ''نہیں میں یوں ہی کہتا تھا۔ ایسی کوئی ضرورت نہیں۔''

اس کے بعد اس وارڈر نے کئی بار پوچھا۔ ''کہو تو کاغذ پنسل لا دوں۔'' لیکن چھر دھر نے ہر بار یہی کہا۔ ''کوئی ضرورت نہیں۔''

بابو جسو دانندن کو جیوں ہی معلوم ہوا کہ چکر دھر آ گرہ جیل میں آ گئے ہیں۔ وہ ان سے ملنے کی کئی بار کوشش کر چکے تھے۔ پر اجازت نہ ملتی تھی۔ عام طور سے چھٹے مہینے اپنے گھر کے کسی فرد سے ملنے کی اجازت مل جاتی تھی، لیکن چکر دھر کے ساتھ یہ رعایت بھی نہ کی گئی تھی، پر جسو دانندن موقع پڑنے پر خوشامد بھی کر سکتے تھے۔ اپنا سارا زور لگا کر آخر انہوں نے اجازت حاصل کر لی۔ اپنے لیے نہیں اہلیا کے لیے۔ اہلیا کا چکر دھر سے ملنا وہ ضروری سمجھتے تھے۔ جس دن سے چکر دھر نے جیل میں قدم رکھا۔ اسی دن سے وہ وفا کی دیوی قیدیوں کی سی زندگی بسر کرنے لگی۔ چکر دھر جیل میں آزاد تھے۔ وہ حالات کو اپنے موافق بنا سکتے تھے۔ اہلیا آزاد ہوتے ہوئے بھی قید تھی۔ وہ حالات پر فتح نہ پا سکتی تھی۔ جن چیزوں پر جان دیتی تھی۔ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی تھی۔ سارا گھر سمجھاتا، کیوں اس طرح جان دیتی ہو، وہ جواب دیتی، مجھے ذرا بھی تکلیف نہیں۔

جس دن اہلیا کو معلوم ہوا کہ چکر دھر سے ملنے کی اجازت مل گئی ہے اسے مسرت کی جگہ ایک عجیب سی بے چینی ہوئی۔ وہ جانے کتنے دبلے ہو گئے ہوں گے۔ کون جانے طبیعت بھی بدل گئی ہو۔ یہ خوف بھی تھا کہ کہیں مجھے ان کے سامنے ہی غش نہ آ جائے۔ کہیں میں چلا چلا کر رونے نہ لگوں۔

صبح سویرے اٹھ کر اس نے اشنان کیا اور بہت دیر تک بیٹھی پرارتھنا کرتی رہی پھر جسو دانندن کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر جیل چلی۔

جیل میں پہنچتے ہی ایک عورت نے اس کی تلاشی لی اور اسے قریب کے ایک کمرے میں لے گئی۔ اہلیا کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اس عورت کو اپنے سامنے دیکھ کر اسے کچھ ڈھارس ہو رہی تھی۔ نہیں تو وہ شاید چکر دھر کو دیکھتے ہی ان کے پیروں سے لپٹ جاتی۔ سر

جھکائے بیٹھی تھی کہ چکر دھر نے کمرے میں قدم رکھا۔ اہلیا انہیں دیکھ کر چونک پڑی۔ شاید کہیں اور دیکھتی تو انہیں پہچان نہ سکتی۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آئے۔ ایک عالم اضطراب میں اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

چکر دھر نے پوچھا۔ ''اہلیا تم اتنی دبلی کیوں ہو۔ کیا بیمار رہو؟''

اہلیا نے سسکیوں کو دبا کر کہا۔ ''نہیں تو میں تو بالکل اچھی ہوں آپ البتہ اتنے دبلے ہو گئے ہیں کہ پہچانے نہیں جاتے۔''

چکر دھر: خیر میرے دبلے ہونے کا تو خاص سبب ہے، لیکن تم کیوں ایسی گھلی جا رہی ہو! کم سے کم اپنے کو اتنا تو بنائے رکھو کہ جب میں چھوٹ کر آؤں تو میری کچھ مدد کر سکو۔ وعدہ کرو کہ آج سے تم اپنی صحت کا زیادہ خیال رکھو گی۔ بابو جی تو خیریت سے ہیں نا؟ اور اماں؟

اہلیا: اماں آپ کو برابر یاد کرتی ہیں اور بابو جی تو میرے ساتھ یہاں آئے ہیں۔ پر یہاں نہیں آئے۔ آج کل طبیعت بھی اچھی نہیں رہتی۔ پر آرام کرنے کی تو انہوں نے قسم کھا رکھی ہے۔ خواجہ محمود سے نہ جانے کس بات پر ان بن ہوگئی ہے۔

اہلیا نے یہ ذکر محض اس لیے کیا تھا کہ چکر دھر کا دھیان اس طرف سے ہٹ جائے اور اس میں اسے کامیابی ہوگئی۔

چکر دھر رنجیدہ ہو کر بولے۔ ''پھر وہی مذہبی جنون سر پر سوار ہو گیا ہوگا۔ مذہب کا صحیح مطلب جب تک لوگ نہ سمجھیں گے برابر یہی حالت رہے گی۔ میرے گھر کی تو کوئی خبر نہ ملی ہوگی؟''

اہلیا نے جواب دیا۔ ''ہاں ملی کیوں نہیں۔ بابو جی حال ہی میں کاشی گئے تھے۔ سنا ہے چھوٹی رانی صاحبہ آپ کے گھر پر اکثر آیا کرتی ہیں۔''

چکر دھر نے تعجب سے پوچھا۔ ''چھوٹی رانی صاحبہ کون؟''

اہلیا: منورما۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے راجہ صاحب سے بیاہ ہوئے۔

چکر دھر: یہ تو عجیب مذاق ہے۔ منورما کی شادی بشال سنگھ کے ساتھ مجھے تو اب بھی یقین نہیں آتا۔

اہلیا: بابو جی کو خود تعجب ہو رہا تھا۔ کہتے تھے منورما نے اپنی خوشی سے شادی کی ہے۔ سارا اختیار چھوٹی رانی کے ہاتھ میں ہے۔ بابو جی کو پانچ ہزار روپے چندے میں دیئے ہیں۔

دفعتاً لیڈی نے کہا۔ ''وقت پورا ہو گیا۔ وارڈرانہیں اندر لے جاؤ۔''

چکر دھر لمحہ بھر بھی اور نہ رکے۔ جیل کے اندر چلے گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا ہے۔

پندرہ

پھاگن کا مہینہ آیا۔ ڈھول منجیرے کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں۔ منشی بجر دھر کی مجلس بھی آراستہ ہوئی۔ یوں تو کئی احباب جمع ہو جایا کرتے تھے پر پھاگن آتے ہی بلاناغہ مردنگ پر تھاپ پڑنے لگی۔ ذی حوصلہ آدمی تھے۔ فکر کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دیتے۔ اپنے جسم کو تکلیفوں سے بچاتے رہتے تھے۔ لڑکا جیل میں ہے۔ بیوی رو رو کر اندھی ہوتی جاتی ہے۔ سیانی لڑکی گھر میں بیٹھی ہے، لیکن منشی جی کو کوئی غم نہیں۔ پہلے پچیس میں گزر کرتے تھے۔ اب پچھتر بھی پورے نہیں پڑتے۔ جس سے ملتے ہیں ہنس کر۔ ہر ایک کی مدد کرنے کو تیار۔ وعدہ سب سے کرتے ہیں ایفا کی فکر نہیں، کسی نے جھک کر سلام کیا اور خوش ہو گئے۔ دونوں ہاتھوں سے برکتیں بانٹتے پھرتے ہیں۔ اپنے محلے کے کئی بےفکروں کو جنہیں کوئی ٹکے کو نہ پوچھتا تھا۔ ریاست میں نوکر رکھا دیا۔ کسی کو چوکیدار، کسی کو محرر کسی کو کارندہ۔ مگر نیکی کر کے دریا میں ڈالنے کی ان کو عادت نہ تھی۔ جس سے ملتے ہیں اپنا ہی قصیدہ پڑھتے ہیں اور خوب مبالغہ کے ساتھ مشہور ہو گیا کہ راجہ اور رانی دونوں ان کی مٹھی میں ہیں۔ ان کے دروازے پر سائلوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ منشی جی کسی کو مایوس نہیں کرتے اور کچھ نہ کر سکیں تو باتوں ہی سے پیٹ بھر دیتے ہیں۔ اپنی دھاک جمانا خوب جانتے

ہیں۔ جو کام منصب سے باہر ہو اس کے لیے بھی ہاں ہاں کر دینا، آنکھیں مارنا، اڑن گھائیاں بتانا۔ ان سبھی علوم میں برق ہیں۔ مطلب کی دنیا ہے۔ وکیل، مختار، نیے، مہاجن، غرض ہر طرح کے لوگ ان سے کوئی امید رکھتے ہیں اور کسی نہ کسی حیلے سے کچھ نہ کچھ دے ہی مرتے ہیں۔

رات کے نو بجے تھے۔ منشی جی مسند پر بیٹھے پیچوان پی رہے تھے کہ جھنکو اپنے سازندوں کے ساتھ آ پہنچا۔ گانا ہونے لگا۔ اتنے میں رانی منورما کی موٹر دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ منشی جی ننگے پاؤں دوڑے۔ ذرا بھی ٹھوکر کھا جاتے تو پھر اٹھنے کا نام نہ لیتے۔ منورما نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''دوڑیئے نہیں۔ آپ ہی کے پاس آئی ہوں اور ایک بڑی خوشخبری سنانے آئی ہوں۔ بابو کل یہاں آ جائیں گے۔ سرکار نے ان کی میعاد گھٹا دی ہے۔''

اتنا سننا تھا کہ منشی جی بے تحاشا دوڑے اور گھر میں جا کر ہانپتے ہوئے نرملا سے بولے۔

''سنتی ہو للو کل آئیں گے۔ منورما رانی دروازے پر کھڑی ہیں۔''

یہی کہہ کر الٹے پاؤں پھر آ پہنچے۔

''اماں جی کیا کر رہی ہیں ان سے ملتی چلوں۔'' منورما گھر میں داخل ہو گئی۔ نرملا آنکھوں میں پریم کی ندی بھرے سر جھکائے کھڑی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اس کے پیروں کے نیچے آنکھیں بچھا دوں۔

دفعتاً منورما نے جھک کر نرملا کے پیروں پر سر جھکا دیا۔ نرملا ساری مدارت ایک دم بھول گئی۔ منورما کے انکسار اور اخلاق نے اسے مسخر کر لیا۔

جب موٹر چلی گئی تو نرملا نے کہا۔ ''دنیا میں ایسی دیویاں بھی ہوتی ہیں۔''

دس بج رہے تھے۔ منشی جی کھانا کھانے بیٹھے تو مارے خوشی کے پھولے نہ سماتے تھے۔ جلدی جلدی دو چار نوالے کھا کر باہر بھاگے اور اپنے دوستوں سے چکر دھر کے استقبال

کے بارے میں باتیں کرتے آدھی رات ہوگئی۔ فیصلہ کیا گیا کہ صبح سویرے شہر میں منادی کرادی جائے اور سیوا سمتی کے آدمی بینڈ باجے کے ساتھ ان کا استقبال کریں۔

صبح کے وقت منورما اپنے کمرے میں آئی اور میز پر بیٹھ کر عجلت میں کچھ لکھنے لگی کہ دیوان صاحب کے آنے کی اطلاع ہوئی اور ایک لمحے میں وہ آ کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ منورما نے پوچھا۔

''ریاست کا بینڈ تیار ہے نا؟''

ہرسیوک: ہاں اسے پہلے ہی حکم دیا جا چکا ہے۔

منورما: جلوس کا انتظام تو ٹھیک ہوگا؟ میں ڈرتی ہوں کہیں گڑبڑ نہ ہو جائے۔

ہرسیوک: راجہ صاحب کی رائے ہے کہ شہر والوں کو جلوس نکالنے دیا جائے۔ ہمارے شامل ہونے کی ضرورت نہیں۔

منورما نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔ ''راجہ صاحب سے میں نے پوچھ لیا ہے۔ ان کی وہی رائے ہے جو میری ہے۔ اگر حق پر چلنے میں ریاست ضبط بھی ہو جائے تو میں منحرف نہ ہوں گی۔''

دیوان صاحب نے مایوسانہ نظروں سے منورما کو دیکھ کر کہا۔ ''بیٹی میں تمہارے ہی فائدے کے لیے کہتا ہوں۔ تم نہیں جانتیں زمانہ کتنا نازک ہے۔''

منورما برانگیختہ ہو کر بولی۔ ''دادا جی اس بزرگانہ نصیحت کے لیے بہت ہی احسان مند ہوں، لیکن میرا ضمیر اسے قبول نہیں کرتا۔ ابھی سات بجے ہیں۔ آٹھ بجتے بجتے آپ کو اسٹیشن پر پہنچ جانا چاہیے۔''

دیوان صاحب کے جانے کے بعد منورما پھر لکھنے لگی۔ یہ وہ تقریر تھی جو وہ چکر دھر کے خیر مقدم کے موقع پر کرنا چاہتی تھی۔ وہ لکھنے میں اتنی محو تھی کہ اسے راجہ صاحب کے آ کر بیٹھ جانے کی اس وقت تک خبر نہ ہوئی جب تک ان کے پھیپھڑوں نے انہیں کھانسنے پر مجبور نہ کیا۔ منورما نے چونک کر آنکھیں اٹھائیں تو دیکھا راجہ صاحب بیٹھے اس کی طرف

مفتون نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ بولی۔

''معاف کیجیے گا۔ مجھے آہٹ نہ ملی۔ کیا آپ دیر سے بیٹھے ہیں؟''

راجہ صاحب: نہیں تو۔ ابھی ابھی آیا ہوں۔ تم لکھ رہی تھیں۔ میں نے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ میں چاہتا ہوں جلوس اتنا شاندار نکلے کہ کم سے کم اس شہر کی تاریخ میں یادگار ہو جائے۔

منورما: یہی تو میں چاہتی ہوں۔

راجہ: میں فوج کے آگے فوجی وردی میں رہوں گا۔

منورما نے کچھ فکرمند ہو کر کہا۔ ''آپ کا شریک ہونا میرے خیال میں مناسب نہیں ہے۔ آپ یہاں ان کا خیر مقدم کیجیے گا۔ اپنی ذمہ داریوں اور پابندیوں کا لحاظ تو کرنا ہی پڑے گا۔ یوں بھی ہم شبہ کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ تب تو حکام ستو باندھ کر ہمارے پیچھے پڑ جائیں گے۔''

منورما پھر لکھنے لگی۔ یہ راجہ صاحب کے لیے اشارہ تھا کہ آپ کی یہاں ضرورت نہیں۔ پر راجہ صاحب نے جنبش نہ کی۔ ان کی معنون آنکھیں پراگ کے پیاسے بھونرے کی طرح منورما کے شگفتہ حسن پر منڈلا رہی تھیں۔

دفعتاً نو بجے منورما کرسی سے اٹھی۔ راجہ صاحب بھی کسی درخت کے سایہ میں آرام کرنے والے مسافر کی طرح اٹھے اور آہستہ آہستہ دروازہ پر پہنچ کر وہ ایک بار پھر ٹھہرے اور منورما سے بولے۔

''میں بھی چلوں تو کیا ہرج ہے؟''

منورما نے مسکرا کر کہا۔ ''اچھی بات ہے چلیے۔''

ریلوے اسٹیشن پر کہیں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ چبوترے پر مدرسوں کے طلبا رنگ برنگ کی وردیاں پہنے ہوئے اور سیوا سمتی کے والنٹیر رنگ برنگ کی جھنڈیاں لیے ہوئے کھڑے تھے۔ منورما شہر کی کئی معزز خواتین کے ساتھ والنٹیروں کے بیچ میں کھڑی تھی۔

برآمدے میں راجہ بشال سنگھ اور شہر کے روساء جمع تھے۔ منشی بجر دھر ادھر ادھر پینترے بدلتے اور لوگوں کو ہوشیار رہنے کی تاکید کرتے پھرتے تھے۔

ٹھیک دس بجے انجن دور سے دھواں اڑاتا ہوا دکھائی دیا۔ اب لوگ اپنی جگہوں پر قاعدے کے ساتھ کھڑے تھے، لیکن گاڑی کے آتے ہی سارا شیرازہ بکھر گیا۔ گاڑی آ کر رکی اور چکر دھر اترے۔ منورما بھی چلی، لیکن تین ہی چار قدم چلی تھی کہ ایک بات ذہن میں آئی۔ وہیں ٹھٹک گئی اور ایک عورت کی آڑ سے چکر دھر کو دیکھنے لگی۔ سیوا سمتی والوں کا خیر مقدم ختم ہوا تو راجہ صاحب نے آگے بڑھ کر باشندگان شہر کی طرف سے چکر دھر کو مبارک باد دی۔ جلوس آراستہ ہونے لگا۔ چکر دھر نے یہ تیاریاں دیکھیں تو بولے۔ ''آپ لوگ میری اتنی توقیر کر کے مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ مجھے تماشا نہ بنائیے۔''

اتفاق سے منشی بجر دھر وہیں کھڑے تھے۔ یہ باتیں سن کر بگڑ کر بولے۔ ''تماشا نہیں بننا تھا تو غیروں کے لیے جان دینے کو کیوں تیار ہو گئے تھے۔ تم ہی اپنی عزت نہ کرو گے تو دوسرے کیوں کرنے لگے۔ آدمی کوئی کام کرتا ہے تو روپے کے لیے یا نام کے لیے۔ اگر دو میں سے ایک بھی نہ ہاتھ آئے تو وہ کام کرنا ہی فضول ہے۔'' یہ کہہ کر چکر دھر کو گلے لگا لیا۔ چکر دھر کا زرد چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا اور وہ اور کوئی اعتراض کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ خاموشی سے راجہ صاحب کی بگھی میں آ بیٹھے۔

جلوس روانہ ہوا۔ آگے آگے پانچ ہاتھی تھے جن پر نوبت بج رہی تھی۔ شہر کی سڑکوں اور گلیوں سے ہوتا ہوا دوپہر ہوتے ہوتے یہ جلوس منشی بجر دھر کے دروازے پر پہنچا۔ یہاں ایک خوشنما اور وسیع پنڈال تیار کیا گیا تھا۔ فیصلہ کیا گیا تھا کہ یہاں جلسہ ہو اور چکر دھر کو سپاسنامہ پیش کیا جائے۔ منورما خود سپاسنامہ پڑھ کر سنانے والی تھی۔ لیکن جب پڑھنے کے لیے کھڑی ہوئی تو منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

منورما کی گھبراہٹ دیکھ کر راجہ صاحب اسٹیج پر آ کر کھڑے ہوئے اور بولے۔

''دوستو۔ رانی صاحبہ کی تقریر میں آپ کو جو لطف آتا وہ میری باتوں میں کہاں۔ کوئل

کی جگہ کوا کھڑا ہو گیا۔ شہنائی کی جگہ نرسنگھے نہ لے لی۔ ہمارے دوست بابو چکر دھر رانی صاحبہ کے گرو رہ چکے ہیں اور وہ اب انہیں اسی عقیدت سے دیکھتی ہے۔ اپنے گرو کا خیر مقدم شاگرد کا فرض ہے، لیکن رانی صاحبہ کا نازک دل اس وقت بہت جذباتی ہو رہا ہے کہ آواز کے لیے اس میں جگہ ہی نہیں رہی۔ اس کے لیے وہ قابل معافی ہیں۔ بابو صاحب نے جس ہمت اور استقلال سے بے کسوں کی حمایت کی وہ آپ لوگوں پر روشن ہے۔ آپ کا دل رحم اور محبت کا دریا ہے۔ جس عمر میں دوسرے نوجوان دولت کے دروازے پر ماتھا رگڑتے ہیں آپ نے مادر وطن کی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ میں آپ کا پرانا مداح ہوں۔''

ایک صاحب نے اعتراض کیا۔ ''آپ ہی نے تو انہیں سزا دلوائی تھی۔''

''ہاں میں اسے تسلیم کرتا ہوں۔ میں انسان ہوں اور ثروت کے نشے میں بے خود ہو جانا ایک انسانی کمزوری ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ لوگ مجھے معاف کریں گے۔''

سولہ

آگرے کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں معرکہ آرائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ ذرا سی بات پر دونوں فرقوں کے شوریدہ سر جمع ہو جاتے اور دو چار جانیں تلف ہو جاتیں۔ کہیں کسی نیچے نے ڈنڈی ماری اور مسلمانوں نے اس کی دوکان پر دھاوا بول دیا۔ کہیں کسی جلاہے نے کسی ہندو کا گھڑا چھو لیا اور محلے میں فوجداری ہو گئی۔ ذاتی عداوتیں فرقہ وارانہ جنگ کی صورت اختیار کر لیتی تھیں۔

ہولی کے دن تھے۔ گلیوں میں گلال کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔ اتنی خوشی سے کبھی ہولی نہ منائی گئی تھی۔ اتفاق سے ایک میاں مرغی ہاتھ میں لٹکائے کہیں سے چلے آ رہے تھے۔ ان کے کپڑوں پر دو چار چھینٹے پڑ گئے۔ بس آفت آ گئی۔ سیدھے جامع مسجد پہنچے اور مینار پر چڑھ کر بانگ دی۔

''اے امت رسولؐ! آج ایک کافر کے ہاتھوں میرے دین کا خون ہوا ہے۔ یا تو

کافروں سے انتقام لو یا میں مینار سے گر کر نبیؐ کی خدمت میں فریاد کرنے جاؤں۔''

مسلمانوں نے یہ بانگ سنی اور ان کی تیوریاں بدل گئیں۔ شام ہوتے ہوتے دس ہزار آدمی سروں سے کفن لپیٹے جامع مسجد کے سامنے آ کر جمع ہو گئے۔ سارے شہر میں سنسنی پھیل گئی۔ ہولی کا نشہ ہرن ہو گیا۔ پچکاریاں چھوڑ لوگوں نے لاٹھیاں سنبھال لیں۔

بابو جسوداننددن کبھی اس افسر کے پاس جاتے کبھی اس افسر کے پاس۔ لکھنؤ تار بھیجے۔ دلی تار بھیجے۔ مسلم انجمنوں کے نام تار بھیجے، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا اور بالآخر جب وہ مایوس ہو کر اٹھے تو لشکر اسلام کا دھاوا ہو چکا تھا۔ پہلا وار جسوداننددن پر ہوا۔ بابو صاحب نے پستول نکال لیا، لیکن چھوڑنے کی نوبت نہ آئی۔ ایک اسلامی تلوار نے انہیں شہید کر دیا۔

اس سانحہ کی خبر پاتے ہی مہابیر دل کے جوانوں کا خون کھول اٹھا۔ دو سو آدمی تلواریں لے کر نکل پڑے۔ ہندو محلوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں جو کچھ ہو رہا تھا وہی مسلمان محلوں میں ہندو کرنے لگے۔ اہنسا نے ہنسا کا سر جھکا دیا۔

دفعتاً خبر اڑی کہ بابو جسوداننددن کے گھر میں آگ لگا دی گئی۔ دو ڈھائی ہزار ہندوؤں کی جماعت ڈبل مارچ کرتی ہوئی اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے اس طرف چلی۔ منٹوں کی راہ پلوں میں طے ہوئی۔ دور ہی شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ وہاں کسی مسلمان کا پتہ نہ تھا۔ آگ پشت کی جانب لگی ہوئی تھی۔ باگیشوری ایک کوٹھری میں دروازہ بند کیے بیٹھی تھی۔ ان لوگوں کی آواز سنتے ہی وہ باہر نکل آئی اور بولی۔ ''ہائے میری اہلیا! ارے دوڑو، ڈھونڈو، پاپیوں نے نہ جانے اس کی کیا درگت کی، ہائے میری بچی۔''

ایک نوجوان نے پوچھا۔ ''کیا اہلیا کو اٹھا لے گئے؟''

باگیشوری نے کہا۔ ''ہاں بھیا۔ اٹھا لے گئے۔ منع کر رہی تھی کہ اری باہر نہ نکل مریں گے تو ساتھ مریں گے لیکن نہ مانی۔ جا کر خواجہ محمود سے کہو۔ اس کا پتہ لگائیں، کہنا تمہیں شرم نہیں آتی۔ جس لڑکی کو بیٹی بنا کر میری گود میں سونپا تھا آج اسی کی آبرو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ ہم سے اب ان کی کیا دشمنی تھی جس سے دشمنی تھی وہ تو رخصت ہو گیا۔''

ادھر لوگ خواجہ صاحب کے پاس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ دروازے پر جسودانندن کی لاش پڑی ہے اور خواجہ صاحب بیٹھے رو رہے ہیں۔ ان لوگوں کو دیکھتے ہی بولے۔

''تم لوگ سمجھتے ہو گے یہ میرا دشمن تھا۔ خدا جانتا ہے۔ مجھے اپنا بھائی یا بیٹا اس سے زیادہ عزیز نہ تھا۔ اگر مجھ پر کسی کا ہاتھ اٹھتا تو جسودانندن اس وار کو اپنی گردن پر لیتا۔ پھر بھی ہم دونوں کی زندگی کے آخری سال میدان آرائیوں میں گزرے اور آج اس کا یہ انجام ہوا۔ خدا جانتا ہے کہ ہم دونوں نے ہمیشہ اتحاد کی کوشش کی۔ اب بھی میرا ایمان ہے کہ اتحاد ہی سے اس بدنصیب قوم کی نجات ہو گی، لیکن خدا جانے وہ کونسی غیبی طاقت تھی جو ہم دونوں کو برسر پرخاش رکھتی تھی ہم دونوں ایک ہی مکتب میں پڑھے۔ ایک ہی اسکول میں تعلیم پائی۔ ایک ہی میدان میں کھیلے پر کون جانتا تھا کہ اس دوستی کا یہ انجام ہو گا۔''

ایک نوجوان نے کہا۔ ''ہم لوگ آخری رسوم کے لیے لاش لے جانا چاہتے ہیں۔''

''لے جاؤ بھائی میں ساتھ چلوں گا۔ میرے کندھا دینے میں کوئی ہرج تو نہیں ہے؟ اتنی رعایت تو میرے ساتھ کرنی ہی پڑے گی۔''

ایک نوجوان نے کہا۔ ''اہلیا کو بھی اٹھا لے گئے۔''

خواجہ: کیا اہلیا کو۔ میری اہلیا کو۔ کب؟

نوجوان: آج ہی، گھر میں آگ لگانے سے پہلے۔

خواجہ: کلام مجید کی قسم جب تک اہلیا کو ڈھونڈ نہ نکالوں گا مجھے دانہ پانی حرام ہے۔ تم لوگ لاش لے جاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔ اہلیا کی تلاش میں جاتا ہوں۔ سارے شہر کی خاک چھان ڈالوں گا۔ بھائی سے میری طرف سے عرض کر دینا۔ مجھ سے ملال نہ رکھیں۔ جب تک خواجہ زندہ ہے انہیں کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ کہہ دینا محمود یا تو اہلیا کو ڈھونڈ لائے گا یا منہ میں کالک لگا کر ڈوب مرے گا۔

یہ کہہ کر خواجہ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ لکڑی اٹھائی اور باہر نکل گئے۔

چکر دھر کو آگرے کے بلوے، جسودانندن کے قتل اور اہلیا کے اغوا کی خبر ملی تو انہوں

نے ایک اضطراب کے عالم میں منشی جی کو وہ خط سنایا اور بولے۔ ''اب میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے۔''

منشی جی: جا کر کرو گے ہی کیا۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔

چکر دھر: کم سے کم اہلیا کا پتہ تو لگا لوں گا۔

بجر دھر: بالکل فضول۔ پہلے تو اس کا پتہ لگنا ہی مشکل ہے اور لگ بھی گیا تو تمہارا اس سے کیا تعلق۔ اب وہ مسلمانوں کے ساتھ رہ چکی تو کون ہندو اسے پوچھے گا؟

چکر دھر: اسی لیے تو میرا جانا اور بھی ضروری ہے۔

بجر دھر: ایسی بہو کے لیے ہمارے گھر میں کوئی جگہ نہیں۔

چکر دھر نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔ ''وہ آپ کے گھر میں نہ آئیں گی۔''

بجر دھر نے بھی اتنی ہی بے مروتی سے کہا۔ ''اگر تمہارا خیال ہے کہ بیٹے کی محبت سے لاچار ہو کر میں اسے قبول کر لوں گا۔ تو یہ تمہاری غلطی ہے۔ اہلیا میرے گھر کی دیوی نہیں ہو سکتی۔ چاہے اس کے لیے مجھے بیٹے کی جدائی ہی کیوں نہ برداشت کرنی پڑے۔''

چکر دھر پیچھے پھرے ہی تھے کہ نرملا نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور مادرانہ فہمائش کے انداز سے بولیں۔ ''بچہ تم سے ایسی امید نہ تھی۔ اب بھی ہمارا کہنا مان لو۔ خاندان میں داغ نہ لگاؤ۔''

چکر دھر نے ہاتھ چھڑا کر کہا۔ ''میں نے آپ کی مرضی کو ہمیشہ مقدم سمجھا ہے۔ لیکن اس معاملے میں مجبور ہوں۔''

بجر دھر: یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟

چکر دھر: جی۔ ہاں۔ آخری۔

یہ کہتے ہوئے چکر دھر باہر نکل آئے اور کچھ کپڑے ساتھ لے کر اسٹیشن کی طرف چل دیئے۔

چکر دھر آگرے پہنچے تو سویرا ہو گیا تھا۔ ایک لمحہ تک وہ کھڑے سوچتے رہے کہاں

جاؤں۔ بابو جسودانندن کے گھر جانا بے کار تھا۔ آخر انہوں نے خواجہ محمود کے گھر جانے کا فیصلہ کرلیا۔

خواجہ صاحب کے دروازے پر پہنچے تو دیکھا کہ ہزاروں آدمی ایک لاش کے گرد کھڑے ہیں اور اسے قبرستان لے جانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ چکر دھر کو اندیشہ ہوا کہ کہیں خواجہ صاحب تو نہیں قتل کر دیئے گئے۔ کسی سے پوچھنا ہی چاہتے تھے کہ دفعتاً خواجہ صاحب نے آ کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور ڈبڈبائی آنکھوں سے بولے۔ ''خوب آئے بیٹا۔ تمہیں آنکھیں ڈھونڈ رہی تھیں۔ جانتے ہو یہ کس کی لاش ہے۔ یہ میری آنکھوں کا نور، میرے دل کا سرور، میرا لختِ جگر ہے جس کی ذات سے زندگی کی ساری امیدیں وابستہ تھیں، لیکن خدا جانتا ہے اس کی موت پر میری آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ نکلا ہے۔ اس نے وہ فعل کیا ہے جو انسانیت کے درجہ سے گرا ہوا ہے۔ تمہیں اہلیا کے بارے میں تو خبر ملی ہوگی؟''

چکر دھر: جی ہاں۔ شاید کچھ بدمعاش اسے پکڑ لے گئے۔

خواجہ: یہ وہی بدمعاش ہے جس کی لاش تمہارے سامنے پڑی ہوئی ہے۔ وہ اسی کی حرکت تھی۔ میں تو سارے شہر میں اہلیا کو تلاش کرتا پھرتا تھا۔ اور وہ میرے ہی گھر میں قید تھی۔ یہ ظالم اس پر جبر کرنا چاہتا تھا۔ آج اس نے موقع پا کر اسے جہنم کا راستہ دکھا دیا۔ سینے میں چھری گھونپ دی۔

چکر دھر: مجھے یہ سن کر سخت افسوس ہوا۔ مجھے آپ کے ساتھ کامل ہمدردی ہے۔ آپ جیسا انصاف پرور، حق پرست آدمی اس وقت دنیا میں اور نہ ہوگا۔ اہلیا اب کہاں ہے؟

خواجہ: اسی گھر میں۔ صبح سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ چل تجھے گھر پہنچا دوں۔ مگر جاتی ہی نہیں۔ بس بیٹھی رو رہی ہے۔

جنازہ اٹھایا گیا۔ سوگواروں کا جمِ غفیر جنازہ کے ساتھ تھا۔ چکر دھر بھی خواجہ صاحب کے ساتھ قبرستان تک گئے۔ جس وقت لاش قبر میں اتاری گئی خواجہ صاحب رو پڑے۔

ہاتھوں سے مٹی دے رہے تھے اور آنکھوں سے آنسوؤں کی بوندیں مرنے والے کی میت پر گر رہی تھیں۔ چکر دھر بھی آنسوؤں کو نہ روک سکے۔ دوپہر ہوتے ہوتے لوگ گھر لوٹے۔ خواجہ صاحب ذرا دم لے کر بولے۔

''آؤ بیٹا تمہیں اہلیا کے پاس لے چلوں۔ اسے تشفی دو۔''

یہ کہہ کر خواجہ صاحب نے چکر دھر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اندر چلے۔ چکر دھر کا دل بانسوں اچھل رہا تھا۔ اہلیا کے دیدار کے لیے وہ اتنے بے قرار کبھی نہ تھے۔ وہ ایک کھڑکی کے سامنے کھڑی باغیچہ کی طرف تاک رہی تھی۔ چکر دھر کو دیکھ کر چونک پڑی اور گھونگھٹ میں منہ چھپا لیا۔ پھر ایک ہی لمحہ میں وہ ان کے پیروں کو پکڑ کر آنسوؤں سے دھونے لگی۔

چکر دھر بولے۔ ''مجھے شرمندہ نہ کرو اہلیا۔ مجھے تمہارے قدموں میں سر جھکانا چاہیے۔ تم الٹی گنگا بہا رہی ہو۔''

یہ کہہ کر انہوں نے اہلیا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مگر وہ ہاتھ چھڑا کر ہٹ گئی اور کانپتی آواز میں بولی۔ ''نہیں، نہیں میرے جسم کو ہاتھ نہ لگائیے۔ سونگھا ہوا پھول دیوتاؤں پر نہیں چڑھایا جاتا۔ آپ کی خدمت کرنا میری تقدیر میں نہ تھا۔ میں نامراد پیدا ہوئی اور نامراد ہی مروں گی۔ آپ میرے لیے افسوس نہ کریں۔ اماں جی کو بھی سمجھا دیجیے گا.....''

چکر دھر سے اب رہا نہ گیا۔ انہوں نے پھر اہلیا کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولے۔

''اہلیا جس جسم میں پاکیزہ اور بے داغ روح جلوہ گزیں ہوتی ہے وہ جسم بھی پاکیزہ اور بے داغ ہو جاتا ہے۔ میری نظروں میں تم آج اس سے کہیں زیادہ پاکیزہ ہو جتنی پہلے تھیں۔''

اہلیا کئی منٹ تک چکر دھر کے کندھے پر سر رکھے روتی رہی۔ پھر بولی۔ ''تم صرف میرے اوپر ترس کھا کر یہ رسوائی کا بوجھ اپنے سر لے رہے ہو یا سچی محبت سے؟''

چکر دھر کا دل بیٹھ گیا۔ اہلیا کی سادگی اور صاف گوئی نے انہیں ان باتوں کے اظہار کے لیے مجبور کر دیا جو وہ نہ کہنا چاہتے تھے۔ ہاں اس کا رنج ضرور ہوا کہ وہ انہیں اسفلہ اور

تنگ نظر سمجھ رہی ہے۔ بولے۔ ''تمہیں کیا معلوم ہو رہا ہے؟''

اہلیا: تمہارے دل میں محبت سے زیادہ رحم کا خیال ہے۔

چکر دھر: بالکل غلط ہے اہلیا۔ تم میرے ساتھ بے انصافی کر رہی ہو۔

اہلیا: جس چیز کو لینے کی میری بساط نہیں ہے اس پر ہاتھ نہ بڑھاؤں گی۔ میرے لیے وہی بہت ہے جو آپ دے رہے ہیں۔ میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتی ہوں۔

دفعتاً اہلیا نے کہا۔ ''مجھے خوف ہے کہ مجھ سے رشتہ کر کے آپ رسوا نہ ہو جائیں۔ شاید آپ کے والدین آپ سے کنارہ کش ہو جائیں۔ میرے لیے اس سے زیادہ خوش نصیبی کی کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ آپ کی خادمہ بنوں لیکن آپ کی رسوائی اور تحقیر کا خیال کر کے بھی دل میں آتا ہے کہ کیوں نہ اس زندگی کا خاتمہ کر دوں؟''

چکر دھر نے دردناک لہجے میں کہا۔ ''ایسی باتیں نہ کرو اہلیا۔ اگر دنیا میں اب بھی کوئی ایسا کمینہ آدمی ہے جو تمہاری دلیرانہ جاں نثاری کی قدر نہ کرے تو وہ انسان نہیں اور نہ میں والدین کی رضامندی پر اپنے ضمیر کی آزادی کو قربان کر سکتا ہوں۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ دل میں ایسے خیالات کو جگہ نہ دو۔''

اہلیا نے اب کی مرتبہ محبت سے سرشار آنکھیں چکر دھر کی طرف پھیریں۔ وہ آگ جو اس کے دل و دماغ جو جلائے ڈالتی تھی بجھ گئی اور اس کی پرسکون نگاہوں میں چکر دھر نورانی محبت سے منور دکھائی دیئے۔

بابو جسودانندن کے آخری مراسم کے تیسرے دن چکر دھر اور اہلیا کی قسمتیں باہم مربوط ہو گئیں۔ چکر دھر تو ابھی کچھ دن اور ٹالنا چاہتے تھے لیکن باگیشوری بہت مصر تھی۔ شادی میں کسی قسم کی نمائش نہ کی گئی۔

جس دن چکر دھر اہلیا کو رخصت کرا کے چلے ہزاروں آدمی انہیں اسٹیشن پر پہنچانے آئے۔ باگیشوری کا روتے روتے برا حال تھا۔ جی چاہتا اہلیا کو پکڑ لوں۔

چکر دھر کے سامنے ایک دوسرا ہی مسئلہ تھا۔ وہ گھر تو جا رہے تھے، لیکن اس گھر کے

دروازے ان کے لیے بند تھے۔ باپ کا غصہ ماں کی ناراضگی۔ رشتہ داروں کا احتراز، یہ ساری مصیبتیں گھر پر ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ سب سے مشکل مسئلہ یہ تھا کہ گاڑی سے اتر کر جائیں گے کہاں؟ ان تفکرات سے ان کا چہرہ اتنا گھرا ہوا تھا کہ اہلیا نے ان کی طرف دیکھا تو چونک پڑی بولی۔

''آپ اتنے متفکر کیوں ہیں؟ کیا ابھی سے میری فکر سوار ہوگئی؟''

چکر دھر نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ''متفکر تو نہیں ہوں۔ یہ تو خوش ہونے کا موقع ہے۔''

مگر چکر دھر جتنا اپنے اضطراب کو چھپاتے تھے اتنا ہی وہ اور بھی عیاں ہوتا جاتا تھا۔ جیسے کوئی مفلس اپنی ساکھ بنائی رکھنے میں اور بھی مفلس ہوتا جاتا ہے۔ اہلیا نے گلہ کر کے کہا۔

''خیر نہیں بتانا چاہتے تو نہ بتاؤ، لیکن اس کے معنی یہ ہیں کہ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں۔'' یہ کہتے کہتے اہلیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ چکر دھر اسے اب ضبط نہ ہو سکا۔ انہوں نے اختصار سے والدین کی ناراضگی کی داستان اول سے آخر تک کہہ سنائی اور الہ آباد اترنے کی تجویز پیش کی۔

اہلیا نے خودداری کی شان سے کہا۔ ''نا۔ گھر رہتے الہ آباد کیوں اتریں۔ ماں باپ کی ناراضگی سے کوئی اپنا گھر نہیں چھوڑتا۔ وہ کتنے ہی ناراض ہوں، ہیں تو اپنے ہی ماں باپ، آپ ان فکروں کو دل سے نکال ڈالیے۔ انہیں منانے کی ذمہ داری مجھ پر چھوڑ دیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں انہیں منالوں گی۔''

رات دس بجتے بجتے گاڑی بنارس پہنچی۔ اہلیا کے اطمینان دلانے پر بھی چکر دھر بہت متفکر تھے کہ کیسے کیا ہو گیا۔ لیکن انہیں کتنا تعجب ہوا جب منشی جی کو انہوں نے دو آدمیوں کے ساتھ اسٹیشن پر انتظار میں کھڑے پایا۔ منشی جی کی اس بزرگانہ شفقت نے انہیں اتنا متاثر کیا کہ جا کر ان کے پیروں پر گر پڑے۔ منشی جی نے انہیں سینے سے لگا لیا اور ان کے اشک سعادت کو رومال سے پونچھتے ہوئے بولے۔

''کم سے کم ایک تار تو دے دیتے کہ میں فلاں گاڑی سے آ رہا ہوں۔ خط تک نہ لکھا۔ یہاں برابر دس روز سے دو بار اسٹیشن پر دوڑ آتا ہوں اور ایک آدمی ہر دم تمہارے انتظار میں بٹھائے رکھتا ہوں کہ نہ جانے کب کس گاڑی سے آ جاؤ۔ کہاں ہے بہو؟ چلو اتار لائیں۔ بہو کے ساتھ یہیں ٹھہرو۔ اسٹیشن ماسٹر سے کہہ کر ویٹنگ روم کھلوائے دیتا ہوں۔ میں دوڑ کر ذرا باجے گاجے کی فکر کر لوں۔ یہاں لوگ کیا جانیں گے کہ بہو آئی ہے۔ وہاں کی بات اور تھی۔ یہاں بات اور ہے۔''

یہ کہہ کر منشی جی چکر دھر کے ساتھ اہلیا کے ڈبے کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ اہلیا نے آہستہ سے اتر کر ان کے قدموں پر سر رکھا۔ منشی جی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی اور دونوں آدمیوں کو ویٹنگ روم میں بٹھا کر بولے۔

''کسی کو اندر مت آنے دینا۔ میں نے صاحب سے کہہ دیا ہے۔ میں کوئی گھنٹہ بھر میں آ جاؤں گا۔''

چکر دھر نے دبی زبان سے کہا۔ ''اس وقت دھوم دھام کرنے کی ضرورت نہیں۔ سویرے تو سب کو معلوم ہو ہی جائے گا۔''

منشی جی نے لکڑی سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''سنتی ہو بہو۔ ان کی باتیں؟ سویرے لوگ جان کر کیا کریں گے۔ دنیا کیا جانے گی کہ بہو کب آئی؟''

منشی جی چلے گئے تو اہلیا نے چکر دھر کو آڑے ہاتھوں لیا۔

''تم تو کہتے تھے کہ بڑے بدمزاج آدمی ہیں۔ مجھے تو یہ دیوتا معلوم ہوتے ہیں۔''

چکر دھر شرمندہ ہو گئے۔ اس کی تردید نہ کی مگر ان کا دل کہہ رہا تھا کہ دادا اس وقت دنیا کو دھانے کے لیے کتنی ہی دھوم دھام کر لیں، گھر میں کوئی نہ کوئی گل کھلے گا ضرور۔

منشی جی کو گئے ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا کہ منورما آ کر دروازے پر کھڑی ہو گئی۔ اس نے دروازے پر سے کہا۔ ''واہ بابو جی آپ چپکے چپکے بہو کو اڑا لائے اور مجھے خبر تک نہ دی۔ منشی جی نہ کہتے تو مجھے معلوم ہی نہ ہوتا۔ آپ نے اپنا تو گھر بسا لیا۔ میرے لیے بھی

کوئی سوغات لائے؟''

یہ کہہ کر وہ اہلیا کے پاس گئی اور دونوں گلے ملیں۔ منورما نے اپنا جڑاؤ کنگن اہلیا کے ہاتھ میں پہنا دیا۔

اہلیا نے اسے کرسی پر بٹھا دیا اور پان الائچی پیش کرتی ہوئی بولی۔ ''میری وجہ سے آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ یہ آپ کے آرام کا وقت تھا۔''

چکر دھر باہر چلے گئے وہ جانتے تھے کہ میرے روبرو دونوں کو باتیں کرنے میں حجاب ہوگا۔ منورما نے گرسنہ آنکھوں سے اہلیا کو دیکھ کر کہا۔ ''نہیں نہیں مجھے ذرا بھی تکلیف نہیں ہوئی۔ میں تو یوں بھی بارہ ایک بجے تک نہیں سوتی۔ تم سے ملنے کا مدت سے اشتیاق تھا۔ تم بہت خوش قسمت ہو۔ تم نے ایسا رفیق پایا جو ظاہر میں انسان، باطن میں فرشتہ ہے۔''

اہلیا نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ کے لیے کوئی سوغات تو لائے ہی نہیں۔''

''میرے لیے تم سے بڑھ کر اور کیا سوغات لاتے۔ میں دنیا میں اکیلی تھی۔ بہن پا کر دو کیلی ہو جاؤں گی۔''

''میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گی۔ آپ کے حسن اخلاق کی تعریف کرتے ان کی زبان نہیں تھکتی۔''

اتنے میں باجوں کی دھوں، دھوں، پوں، پوں سنائی دی۔ منشی جی بارات سجائے چلے آ رہے تھے۔ اہلیا کے دل میں خوشی کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اسے جن باتوں کا خواب میں بھی گمان نہ تھا، وہ سب پوری ہوتی جاتی تھیں۔ کبھی اس کا خیر مقدم اس شان سے ہوگا۔ کبھی ایک بڑی رانی اس کی سہیلی بنے گی۔ اس نے سوچا بھی نہ تھا۔

منورما نے اسے آہستہ لا کر سکھیال پر بٹھا دیا۔ برات چلی۔ چکر دھر ایک گھوڑے پر سوار تھے۔

سترہ

راجہ صاحب جگدیش پور آتے تو اس طرح بھاگتے گویا کسی دشمن کے گھر آئے

ہوں۔ رونی کو راجہ صاحب کی یہ سرد مہری بہت شاق گزرتی۔ وہ ان پر دل کا غبار نکالنے کا موقع تلاش کرتی رہتی تھی۔ آخر ایک دن وہ منورما پر پل پڑی۔ بات کچھ نہ تھی۔ منورما نے تجاہل سے کہا تھا۔ ''یہاں آپ لوگوں کی زندگی بڑے سکون سے کٹتی ہوگی۔ شہر میں تو روز ایک نہ ایک خلجان سر پر سوار رہتا ہے۔''

رونی بھری بیٹھی تھی۔ اینٹھ کر بولی۔ ''ہاں بہن کیوں نہ ہو۔ دنیا میں ایسے آدمی بھی ہیں جنہیں ہمسایہ کے گھر فاقہ دیکھ کر بھی جلن ہوتی ہے۔ کسی کو بھوک کسی کو جوگ، یہ پرانا دستور ہے۔ تم کیا کروگی۔''

منورما نے پھر اسی بھولے پن سے کہا۔ ''اگر تمہیں وہاں کی زندگی بہت دل چسپ معلوم ہوتی ہے تو چلی کیوں نہیں آتیں۔ تمہیں کسی نے منع کیا ہے؟''

رونی نے ناک سکوڑ کر کہا۔ ''بھلا مجھ میں وہ ہنر کہاں ہے کہ ادھر راجہ کو مٹھی میں لیے رہوں۔ ادھر حکام کی ناز برداری بھی کروں۔ یہ ہنر تو پڑھی لکھی شہر والیوں کو آتا ہے۔ گنوارنیں یہ تریا چرتر کیا جانیں۔''

منورما کو سکتہ سا ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوا ایک شعلہ سا پیروں سے اٹھا اور سر سے نکل گیا۔ گویا کسی نے ہزاروں بھالے کلیجے میں بھونک دیئے۔ وہ دس بارہ منٹ تک اسی طرح نقش دیوار بنی کھڑی رہی۔ راجہ صاحب موٹر پر بیٹھے اسے بار بار بلوا بھیجتے تھے۔ اور اسے خبر نہ ہوتی تھی۔ آخر خود اندر آئے۔ دور سے ہی پکارا، منورما کیا کر رہی ہو چلو دیر ہو رہی ہے، منورما نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ تب انہوں نے قریب آ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا، اور کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ اس کا چہرہ دیکھ کر چونک پڑے۔ وہ مارگزیدوں کی طرح ٹکٹکی باندھے دیوار کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گویا آنکھوں کے راستے جان نکل گئی ہو۔

راجہ صاحب نے گھبرا کر پوچھا۔ ''نورا کیسی طبیعت ہے؟''

منورما نے سسکتے ہوئے کہا۔ ''اب میں یہیں رہوں گی۔ آپ جا کر میری سب چیزیں یہیں بھجوا دیجیے۔''

راجہ صاحب سمجھ گئے کہ رونی نے ضرور کوئی زہر اگلا ہے۔ اس کی طرف لال لال آنکھیں کر کے بولے۔ ''تمہارے کارن یہاں سے جان لے کر بھاگا۔ پھر بھی تمہیں تسکین نہیں۔ میری خوشی ہے جس سے چاہتا ہوں بولتا ہوں۔ تمہیں اس کی جلن کیوں ہوئی؟''

رونی: جلن ہوگی میری بلا کو۔ تم یہاں تھے ہی تو کیا کر دیا تھا۔ یہاں تو کتنا گھر رہے ویسے رہے بدیس، تقدیر میں رونا ہے روتی ہوں۔

راجہ صاحب کا غصہ بڑھتا جاتا تھا، لیکن منورما کے سامنے وہ اپنی حیوانی صورت دکھاتے ڈرتے تھے۔ مگر اب ضبط نہ ہو سکا۔ بولے۔ ''تم جیسی عورتوں کو زہر کھا کر مر جانا چاہیے زندگی تلخ کر دی۔''

رونی نے شعلہ بار آنکھوں سے راجہ صاحب کو دیکھا اور پاندان کو ٹھکراتی، لوٹے کا پانی گراتی وہاں سے چلی گئی۔

راجہ صاحب بہت دیر تک سمجھایا کیے، لیکن منورما نے نہ مانی۔ اسے اندیشہ ہوا کہ مجھ سے یہ بدگمانی رونی ہی کو نہیں ہے۔ یہاں سبھی کے دلوں میں میری طرف سے یہی سلوک ہوں گے۔ اس بدگمانی کا ازالہ یہاں سب کے ساتھ رہنے ہی سے ہو سکتا تھا اور یہی اس کی ضد کا سبب تھا۔ آخر راجہ صاحب نے مایوس ہو کر کہا۔ ''تو پھر میں بھی کاشی چھوڑ دیتا ہوں۔ تم جانتی ہو کہ اکیلے وہاں ایک دن مجھ سے نہ رہا جائے گا۔''

یکا یک منشی بجر دھر لاٹھی ٹیکتے آتے دکھائی دیئے۔ چہرہ اترا ہوا۔ پاجامے کا ازار بند نیچے لٹکتا ہوا۔ آنگن میں کھڑے ہو کر بولے۔ ''رانی آپ کہاں ہیں ذرا مہربانی کر کے یہاں آ جائیے گا یا حکم ہو تو میں ہی آؤں؟''

راجہ صاحب نے چڑھ کر کہا۔ ''کیا ہے؟ یہیں چلے آئیے۔ آپ کو اس وقت یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ سب لوگ یہیں چلے آئے کوئی وہاں بھی تو چاہیے۔''

منشی جی کمرے میں آ کر بے کسانہ انداز سے بولے۔ ''کیا کروں حضور گھر تباہ ہوا جا

رہا ہے حضور سے نہ روؤں تو کس سے روؤں ۔للو نہ جانے کیا کرنے پر آمادہ ہے۔''

منورما نے خائف ہو کر کہا۔''کیا بات ہے منشی جی۔ابھی آج ہی تو بابو جی وہاں میرے پاس آئے تھے کوئی نئی بات نہیں کہی۔''

منشی جی: وہ اپنی بات کسی سے کہتا ہے کہ آپ سے کہے گا۔مجھ سے بھی کچھ نہیں کہا، لیکن آج الہ آباد جانے کو تیار بیٹھا ہے۔بہو کو بھی لیے جاتا ہے۔

منورما: آپ نے پوچھا نہیں کہ کیوں جا رہے ہو؟ ضرور کوئی بات ہوئی ہو گی۔نہیں تو بہو کو لے کر نہ جاتے۔گھر میں کسی نے طعنہ تو نہیں مارا؟

منشی جی: علم کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔حضور جو کسی نے چوں تک کی ہو۔طعنے تو اسے دیئے جاتے ہیں جو اپنی حیثیت سے بڑھے۔وہ تو سیوا اور پریم کی دیوی ہے۔ہاں اتنا ضرور ہے کہ ہم دونوں اس کا چھوا نہیں کھاتے۔

منورما نے سر ہلا کر کہا۔''اچھا یہ بات ہے! بھلا بابو جی یہ کب برداشت کرنے لگے۔میں اہلیا کی جگہ ہوتی تو اس گھر میں ایک لمحے بھر بھی نہ رہتی۔وہ نہ جانے کیسے اتنے دنوں رہ گئی۔''

منشی جی: آپ ذرا چل کر اسے سمجھا دیں۔مجھ پر اتنا رحم کریں۔ہمیشہ سے جو باتیں مانتے آئے ہیں،وہ اب نہیں چھوڑی جاتیں۔

منورما: تو نہ چھوڑیئے۔آپ کو کوئی مجبور نہیں کرتا۔آپ کو اپنی رسوم پیاری ہیں اور ہونی چاہئیں تو انہیں بھی اپنی عزت پیاری ہے اور ہونی چاہیے۔میں جیسے آپ کو مجبور نہیں کر سکتی اسی طرح انہیں بھی مجبور نہیں کر سکتی۔آپ جانیں اور وہ جانیں۔مجھے بیچ میں نہ ڈالیے۔

منشی جی بڑی امیدیں باندھ کر دوڑے آئے تھے۔یہ فیصلہ سنا تو کمر ٹوٹ گئی۔سر پر ہاتھ رکھ کر سوچنے لگے۔اب کیا کروں۔

منورما وہاں سے چلی گئی۔ابھی اسے اپنے رہنے کے لیے کوئی جگہ ٹھیک کرنی تھی۔شہر

سے اپنی ضروری چیزیں منگوانی تھیں۔

آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھی پر منورما کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ اسے خیال آیا کہ چکر دھر بالکل خالی ہاتھ ہیں۔ بیوی کے ساتھ خالی ہاتھ۔ نئی جگہ نہ کسی سے راہ نہ رسم، اور شرمیلے آدمی۔ انہیں پریاگ میں کتنی تکلیف ہوگی۔ میں نے بڑی غلطی کی۔ مجھے منشی جی کے ساتھ چلے جانا چاہیے تھا۔ شاید بابو میرا انتظار کر رہے ہوں۔

اس نے گھڑی دیکھی ایک بج گیا تھا۔ اس کے دل میں خیال آیا کیوں نہ اسی وقت چلی جاؤں۔ گھنٹہ بھر میں پہنچ جاؤں گی، لیکن پھر خیال آیا کہ اس وقت جاؤں گی تو لوگ کیا کہیں گے۔ وہ پھر آ کر لیٹ گئی اور سو جانے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے نیند آ گئی لیکن دیر سے سونے پر بھی منورما کو اٹھنے میں دیر نہ لگی۔ ابھی سب لوگ سوتے ہی تھے کہ وہ اٹھ بیٹھی اور اپنا ہینڈ بیگ لے کر روانہ ہوگئی۔

چکر دھر بھی علی الصبح اٹھے اور چلنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ انہیں ماں باپ کو چھوڑ کر جانا بہت شاق گزر رہا تھا۔ پر اس گھر میں اہلیا کی جو حالت تھی، وہ ان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ گاڑی سات بجے روانہ ہوتی تھی۔ وہ اپنا بستر اور کتابیں نکال رہے تھے اور اہلیا اندر اپنی ساس اور نند کے گلے مل کر رو رہی تھی کہ اتنے میں منورما کی موٹر آتی دکھائی دی۔ چکر دھر مارے شرم کے گڑ گئے۔

منورما نے موٹر سے اترتے ہوئے کہا۔ ''بابو جی ابھی ذرا ٹھہر جائیے اتنی عجلت کیا ہے۔ جب تک مجھے یہ معلوم نہ ہو جائے گا کہ آپ کیوں اور کس ارادے سے جا رہے ہیں۔ میں آپ کو نہ جانے دوں گی۔''

چکر دھر: اگر آپ کو ساری کیفیت معلوم ہوتی تو آپ کبھی مجھے روکنے کی کوشش نہ کرتیں۔

منورما: آپ سمجھتے ہوں گے۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ مگر مجھے آپ کے گھر کی حالت تھوڑی بہت معلوم ہے۔ یہ لوگ اپنے خیالات سے مجبور ہیں اور نہ آپ انہیں دبانا پسند

کریں گے۔ کیوں نہ اہلیا کو کچھ دنوں کے لیے میرے ساتھ رہنے دیجیے۔ میں نے جگدیش پور میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ بھی وہاں رہ سکتے ہیں۔ میری بہت دنوں سے آرزو تھی کہ کچھ دن آپ میرے مہمان ہوں۔ مہمان کیوں ہوں۔ وہ بھی تو آپ کا گھر ہے۔ میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گی۔

چکر دھر: نہیں منورما۔ مجھے جانے دو۔

منورما۔ اچھی بات ہے جایئے۔ لیکن میری نذر قبول کیجیے۔

یہ کہہ کر اس نے اپنا ہینڈ بیگ چکر دھر کی طرف بڑھا دیا۔

چکر دھر: اگر نہ لوں تو؟

''تو میں اپنے ہاتھوں سے آپ کا بوریا بندھنا اٹھا کر گھر میں رکھ آؤں گی۔''

چکر دھر نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ کو اتنی تکلیف نہ اٹھانی پڑے گی۔ میں اسے لیے لیتا ہوں۔ شاید وہاں بھی مجھے کام کرنے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ اس بیگ کا وزن ہی بتلا رہا ہے۔''

تانگا آ گیا۔ چکر دھر اور اہلیا اس پر جا بیٹھے تو منورما بھی اپنی موٹر پر بیٹھ کر چلی گئی۔ گھر کے باقی تینوں آدمی دروازے پر کھڑے روتے رہے۔

اٹھارہ

قومی خدمت کے لیے کہیں بھی موقع کی کمی نہیں۔ صرف دل میں ایثار کا جذبہ ہونا چاہیے۔ چکر دھر الہ آباد میں اچھی طرح جمنے بھی نہ پائے تھے کہ چاروں طرف سے ان کے لیے کھینچ تان ہونے لگی۔ تھوڑے ہی دنوں میں ان کا شمار نیتاؤں میں ہونے لگا۔ ان میں قوم کی محبت تھی، خدمت کا جوش تھا اور تنظیم کی قابلیت تھی۔ سارے شہر میں ایک بھی ایسا آدمی نہ تھا، جو ان کی طرح بے غرض ہو اور لوگ قومی خدمت کو ایک ضمنی کام سمجھتے تھے۔ کسب زر ان کی اصلی غرض تھی۔ چکر دھر کے لیے اس کام کے سوا اور کوئی فکر نہ تھی۔ انہوں نے مضافات شہر میں ایک چھوٹا مکان کرایہ پر لے لیا تھا اور بڑے کفایت سے گزر کرتے

تھے۔ آگرے میں انہیں جتنے روپے ملے تھے وہ سب منشی بجرد ھر کی نذر ہو گئے تھے۔ وہاں روپے کی ہمیشہ قلت رہتی تھی۔ چکر دھر کو اب محسوس ہونے لگا کہ خانہ داری میں پڑ کر کچھ نہ کچھ مستقل آمدنی کی ضرورت ہے۔ اپنے لیے تو انہیں کوئی فکر نہ تھی، لیکن اہلیا کو وہ افلاس کی آزمائش میں ڈالنا نہ چاہتے تھے۔

اگر چکر دھر کو اپنی ہی خانہ داری کا بار سنبھالنا ہوتا تو شاید انہیں زیادہ تکلیف نہ ہوتی کیوں کہ ان کے مضامین بہت مقبول ہوتے تھے اور دو تین رسالوں میں لکھ کر وہ اپنی گزران کے لیے کافی پیدا کر لیتے تھے۔ مگر منشی بجرد ھر کے مارے ان کی ناک میں دم تھا۔ چکر دھر کو بار بار تنگ کرتے۔ انہیں مجبور ہو کر باپ کی امداد کرنی پڑتی تھی۔

اگھن کا مہینہ تھا، خاصی سردی پڑ رہی تھی۔ مگر ابھی تک چکر دھر جاڑوں کے کپڑے نہ بنوا پائے تھے۔ اہلیا کے پاس پرانے کپڑے تھے۔ مگر چکر دھر کے پرانے کپڑے منشی جی کی وجہ سے بچنے ہی نہ پاتے تھے یا تو وہ خود پہن لیتے یا کسی کو دے ڈالتے۔ وہ اسی چکر میں تھے کہ کہیں سے روپے آ جائیں تو ایک کمبل لے لوں۔ آج بڑے انتظار کے بعد لکھنؤ کے ایک ماہوار رسالے کے دفتر سے پچیس روپے کا منی آرڈر آیا تھا اور وہ اہلیا کے پاس کپڑوں کا پروگرام بنا رہے تھے کہ اتنے میں ڈاکیے نے پکارا، خط لے جائیے۔

چکر دھر نے جا کر خط لے لیا اور اسے پڑھتے ہوئے اندر لے آئے اور مایوسانہ انداز سے بولے۔

''میرے آتے ہی گھر والوں پر کچھ ایسی ساڑھ ستی سوار ہو گئی ہے کہ جب دیکھو ایک نہ ایک مصیبت گھیرے ہی رہتی ہے۔ ابھی منگلا بیمار تھی۔ اب اماں بیمار ہے۔ بابو جی کو کھانسی آ رہی ہے۔ آج کل بالائی آمدنی کچھ نہیں ہوتی۔ لکھا ہے پچاس روپے بھیج دو۔''

اہلیا نے پوچھا۔ ''کیا اماں جی بہت بیمار ہیں؟''

''ہاں لکھا تو ہے۔''

''تو جا کر دیکھ ہی کیوں نہ آؤ۔''

چکر دھر نے بے دردی سے کہا۔ ''مجھے بابو جی پر بڑا غصہ آتا ہے۔ ناحق مجھے تنگ کرتے ہیں۔ اماں کی بیماری کا تو بہانہ ہے، سراسر بہانہ۔''

اہلیا: بہانہ ہو یا سچ ہو۔ روپے تو بھیجنے ہی پڑیں گے۔ یہ پچیس روپے بھیج دو، باقی کے لیے لکھ دو کوئی فکر کر کے جلدی بھیج دوں گا۔ تمہاری تقدیر میں گرم کپڑے اس سال نہیں لکھے ہیں۔

پوس کا مہینہ آ گیا تھا۔ زوروں کی سردی پڑنے لگی تھی۔ نہاتے وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پانی کاٹ کھائے گا۔ پر ابھی تک چکر دھر جڑاؤ نہ بنوا سکے۔ ایک دن بادل آئے اور ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ سردی کے مارے چکر دھر کو نیند نہ آتی تھی۔ ایک بار انہوں نے اہلیا کی طرف دیکھا۔ وہ ہاتھ پاؤں سمیٹے چادر سر سے اوڑھے گٹھڑی بنی پڑی ہوئی تھی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر ان کا ضمیر انہیں نفرین کرنے لگا۔ تمہاری قومی خدمت صرف دھوکا ہے، کورا دھوکا۔ جب تم اس عورت کی ضروریات پوری نہیں کر سکتے جو تمہارے اوپر اپنی جان تک نثار کر سکتی ہے تو تم قوم کی خدمت کیا کرو گے۔

دوسرے روز ناشتہ کرتے ہی کہیں باہر نہ گئے۔ بلکہ اپنے کمرے میں جا کر کچھ لکھتے رہے۔ شام کو سات بجے وہ پھر لوٹ آئے اور دس بجے تک کچھ لکھتے رہے۔ اب ان کا یہی دستور ہو گیا کہ اپنے وقت کا بڑا حصہ تصنیف میں صرف کرتے۔ اب وہ خدمت کے بندے نہیں نفس کے بندے تھے۔ پہلے وہ ایسی کھیتی کرتے تھے جہاں دولت تھی نہ شہرت۔ اب دولت بھی ملتی تھی اور شہرت بھی۔ اب رسالوں کے ایڈیٹر ان سے تقاضے کر کے مضامین لکھواتے۔ لوگ ان مضامین کو بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ فلسفہ سے انہیں الفت تھی۔ ان کے مضامین بھی فلسفیانہ ہوتے تھے۔

مگر چکر دھر کو اپنی کامیابیوں پر غرور نہ تھا۔ انہیں کافی دولت ملتی تھی۔ یورپ کے رسائل میں ان کے مضامین چھپتے تھے۔ سماج میں ان کی عزت کم نہ تھی۔ لیکن خدمت کے کاموں میں جو اطمینان انہیں حاصل ہوتا تھا، وہ اب میسر نہ تھا۔ اپنے بدنصیب خستہ حال

بھائیوں کی خدمت کرنے میں جو افتخار آمیز مسرت ہوتی تھی وہ اب معزز جماعت کی دعوتوں میں نہ ہوتی تھی۔ مگر اہلیا خوش تھی۔ وہ اب بھولی بھالی نازنین نہ تھی۔ معاملہ فہم عورت تھی۔ خانہ داری میں مشاق، فراخ دل، نیک مزاج اور اصولوں کی پابند۔ مجال نہ تھی کہ کوئی نوکر اس کی آنکھ بچا کر ایک پیسہ بھی کھا جائے۔ ایشور نے ایک گلعذار بچہ بھی دے دیا۔ زندگی پر بہار ہوگئی۔ اس طرح پانچ سال گزر گئے۔

ایک دن کاشی سے راجہ بشال سنگھ کا تار آیا۔ لکھا تھا۔ ''رانی منورما بہت بیمار ہیں فوراً آیئے۔ بچنے کی امید کم ہے۔''

اہلیا نے کہا۔ ''یہ ہو کیا گیا ہے؟ ابھی تو دادا جی نے لکھا تھا کہ سب خیر و عافیت ہے۔''

چکر دھر: کیا کہا جائے۔ کچھ نہیں۔ یہ سب گھر کی نا اتفاقی کا نتیجہ ہے۔ منورما نے راجہ صاحب سے شادی کر کے سخت غلطی کی۔ سوتنوں نے اس کی زندگی وبال کر دی ہوگی۔

اہلیا: کہو تو میں بھی چلوں۔ دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ ان کی شفقت اور نوازش کبھی نہ بھولے گی۔

چکر دھر: جوگیندر بابو کو ساتھ لیتے چلیں۔ ان سے زیادہ حاذق تو یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں۔

دس بجتے بجتے یہ لوگ یہاں سے ڈاک پر چلے۔ اہلیا کھڑکی سے برسات کا دلفریب منظر دیکھ رہی تھی۔ چکر دھر بے تاب ہو کر گھڑی دیکھتے تھے کہ پہنچنے میں کتنی دیر ہے اور منو کھڑکی سے باہر کود پڑنے کے لیے زور مار رہا تھا۔

چکر دھر جگدیش پور پہنچے تو رات کے آٹھ بجے تھے۔ محل کے دروازے پر غریبوں کو خیرات تقسیم کی جا رہی تھی۔ مگر کنگلے ایک پر ایک ٹوٹے پڑ رہے تھے۔

منشی جی نے چکر دھر کو دیکھتے ہی دوڑ کر گلے لگا لیا۔ اہلیا شوہر کے پیچھے کھڑی تھی۔ منو اس کی گود میں بیٹھا طفلانہ مسرت سے دونوں آدمیوں کا رونا دیکھ رہا تھا۔

دفعتاً راجہ صاحب اندر سے بدحواس دوڑے ہوئے آئے۔ صورت سے معلوم ہو رہا

تھا کہ امید نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ آتے ہی آتے انہوں نے پوچھا۔ ''میرا تار مل گیا تھا؟''

چکر دھر: آج صبح ملا۔ رانی جی کا کیا حال ہے؟

راجہ صاحب: وہ تو اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔ میں کیا کہوں۔ اب تو ایشور ہی کا بھروسہ ہے۔ اچھا یہ شنکھ دھر مہاشے ہیں۔

یہ کہہ کر انہوں نے منو کو گود میں لے لیا اور محبت آمیز نظروں سے دیکھ کر بولے۔ ''میری سکھدا بالکل ایسی ہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی ہو۔ ہو بہو یہی صورت تھی۔''

اندر جا کر چکر دھر نے منورما کو دیکھا۔ وہ موٹے گدوں میں ایسی سما گئی کہ معلوم ہوتا تھا بستر خالی ہے۔ صرف چادر پڑی ہے۔ چکر دھر کی آہٹ پا کر اس نے چادر سے منہ باہر نکالا۔ شمع کی ہلکی روشنی میں کسی بے کس کی آہ، مظلوم آنکھوں سے آسمان کو تاک رہی تھی۔

راجہ صاحب نے آہستہ سے کہا۔ ''نورا تمہارے بابو جی آ گئے۔''

منورما نے تکیے کا سہارا لے کر کہا۔ ''زہے نصیب۔ آیئے بابو جی آپ کے درشن بھی ہو گئے۔ تار نہ جاتا تو آپ کیوں آتے۔''

چکر دھر: مجھے تو بالکل خبر ہی نہ تھی۔ تار پہنچا تو حال معلوم ہوا۔

منورما بچے کو دیکھ کر۔ ''اچھا اہلیا دیوی بھی آئی ہیں۔ اور یہ ٹھاکر شنکھ دھر ہیں۔ ذرا یہاں تو لانا اہلیا اسے چھاتی سے لگا لوں۔''

راجہ صاحب: اس کی صورت سکھدا سے بہت ملتی ہے نورا۔ بالکل اس کا چھوٹا بھائی معلوم ہوتا ہے۔

سکھدا کا نام سن کر اہلیا پہلے بھی چونکی تھی۔ اب پھر چونکی۔ بچپن کے دن کسی بھولے ہوئے خواب کی طرح ادراکات کے دائرے میں آ گئے۔ اس نے گھونگھٹ کی آڑ سے راجہ صاحب کی طرف دیکھا۔ اس کے اپنے حافظے پر ایسی ہی صورت کھنچی ہوئی نظر آئی۔

منو کو گود میں لیتے ہی منورما کے نیم جان جسم میں ایک حرارت سی پیدا ہو گئی۔ بچے کو سینے سے لگائے ہوئے اسے ایسی مسرت ہو رہی تھی گویا برسوں سے پیاسے حلق میں ٹھنڈا پانی پڑ گیا ہو اور اس کی پیاس نہ بجھتی ہو۔ وہ بچے کو لیے ہوئے اٹھ بیٹھی اور بولی۔

''اہلیا۔ میں اب یہ لال تمہیں نہ دوں گی۔ اسے مجھے دے دو۔''

راجہ صاحب نے منورما کو سنبھال کر کہا۔ ''لیٹ جاؤ، لیٹ جاؤ۔ بدن میں ہوا لگ رہی ہے۔ کیا کرتی ہو؟''

مگر منورما بچے کو لیے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئی۔ راجہ صاحب بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑے کہ کہیں وہ گر نہ پڑے۔ کمرے میں صرف چکر دھر اور اہلیا رہ گئی۔ تب اہلیا نے کہا۔

''مجھے اب یاد آ رہا ہے کہ میرا نام بھی سکھدا تھا۔ جب میں بہت چھوٹی تھی تو لوگ مجھے سکھدا کہتے تھے۔''

چکر دھر جھنجھلا کر بولا۔ ''چپ چاپ بیٹھو۔ تم اتنی خوش نصیب نہیں ہو۔ راجہ صاحب کی سکھدا کہیں کھوئی نہیں مر گئی ہوگی۔''

راجہ صاحب اسی وقت بچے کو گود میں لیے ہوئے کمرے میں آئے۔ چکر دھر کے آخری الفاظ ان کے کان میں پڑ گئے۔ بے صبری سے بولے۔ ''نہیں بابو جی میری سکھدا مری نہیں۔ کمبھ کے میلے میں کھو گئی تھی۔ اسے بیس سال ہو گئے۔ اس وقت اس کی عمر کوئی چار سال کی ہوگی۔ بہت تلاش کیا پر کچھ پتہ نہ چلا۔ اس کی ماں اس غم میں مر گئی۔ میں بھی برسوں پاگل بنا رہا۔ آخر صبر کر کے بیٹھ رہا۔''

اہلیا نے سامنے آ کر بے حجابانہ انداز سے کہا۔ ''میں بھی تربینی کے اشنان میں کھو گئی تھی۔ آگرے کی سیوا سمتی والوں نے مجھے کہیں روتا ہوا پایا اور آگرے لے گئے۔ بابو جسودانندن نے میری پرورش کی۔''

راجہ صاحب: تمہاری عمر اس وقت کیا ہوگی؟

اہلیا: چوبیسواں لگا ہے۔

راجہ صاحب: تمہیں اپنے گھر کی کچھ یاد ہے۔ تمہارے دروازے پر کس چیز کا درخت تھا؟

اہلیا: شاید برگد کا درخت تھا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ میں اس کے گودے چن چن کر کھایا کرتی تھی۔

راجہ صاحب نے اور قریب آ کر اس کے منہ کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری ماں کیسی تھی یاد آتا ہے؟''

اہلیا نے سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں یاد کیوں نہیں آتی۔ سانولا رنگ تھا۔ دبلی پتلی اور لمبی تھیں۔ دن بھر کچھ پڑھتی تھیں۔''

راجہ صاحب کانپتی ہوئی آواز میں بولے۔ ''گھر میں اور کون کون لوگ تھے؟''

اہلیا: میری ایک بڑھیا دادی تھیں جو مجھے گود میں لے کر کہانی سنایا کرتی تھیں۔ ایک بوڑھا نوکر تھا۔ جس کے کندھے پر میں روز سوار ہوا کرتی تھی۔ دروازے پر ایک بڑا سا گھوڑا بندھا رہتا تھا۔ دروازے پر ایک کنواں تھا۔ پیچھے کی طرف ایک بڑھیا چمارن کا مکان تھا۔

راجہ صاحب نے فرط اشتیاق سے آغوش پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''بس بس بیٹی۔ آ۔ آ۔ تجھے سینے سے لگا لوں۔ تو ہی میری سکھدا ہے۔ میں بچے کو دیکھتے ہی تاڑ گیا تھا۔ میری سکھدا مل گئی۔''

راجہ صاحب پر مسرت کا ایک جنون طاری ہو گیا۔ چکردھر نے بے رخی کے ساتھ کہا۔

''ابھی آپ کا خاموش رہنا ہی مناسب ہے۔ ممکن ہے آپ غلطی کر رہے ہوں۔''

راجہ صاحب نے زور دے کر کہا۔ ''ذرا بھی، جوہر بھی نہیں۔ میری سکھدا یہی ہے۔ اس نے جتنی باتیں بتائی ہیں۔ سب ٹھیک ہیں۔ مجھے رتی بھر بھی شبہ نہیں رہا۔ ہائے آج اس کی ماتا ہوتی تو اسے کتنی خوشی ہوتی۔ کیا لیلا ہے، ایشور کی۔ ذرا سی گئی اور بڑی ہو کر

آئی ۔میری تاریک زندگی کو روشن کرنے کے لیے چاند سا بچہ بھی لائی ۔آؤ بھیا چکر دھر تمہیں بھی سینے سے لگالوں ۔اب تک تم میرے دوست تھے ۔اب میرے لڑکے ہو۔''

یہ کہتے ہوئے راجہ صاحب اسی جوش میں دیوان خانہ میں جا پہنچے۔دروازے پر ابھی تک کنگلوں کا ہجوم تھا۔دو چار عملے ابھی تک بیٹھے دفتر کا کام کر رہے تھے۔راجہ صاحب نے شنکھ دھر کو کندھے پر بٹھا کر بلند آواز میں کہا۔''یہ دیکھو ایشور کی صحت بیکراں سے میرا نواسا گھر بیٹھے میرے پاس آ گیا۔تم لوگوں کو معلوم ہے کہ بیس سال ہوئے میری لڑکی سکھدا کمبھ کے میلے میں کھو گئی تھی ۔وہی سکھدا آج مجھے مل گئی ہے اور یہ بچہ اس کا لڑکا ہے ۔آج سے تم لوگ اسے اپنا ولی عہد سمجھو۔میرے بعد یہی ریاست کا جانشین ہوگا۔گارڈ سے کہو اپنے ولی عہد کو سلامی دے ۔نوبت خانے میں کہہ دو ۔نوبت بجے ۔آج سے ساتویں دن ولی عہد کے تلک کی رسم ادا ہوگی۔''

یہ حکم دے کر راجہ صاحب بچہ کو گود میں لیے ٹھاکر دوارے میں جا پہنچے۔وہاں اس وقت ٹھاکر جی کے بھوگ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔سادھو سنتوں کا ہجوم تھا۔دفعتاً راجہ صاحب نے آ کر بچہ کو ٹھاکر جی کے سامنے بٹھا دیا اور خود سر و قد ڈنڈوت کرنے لگے۔

پجاری نے کہا۔''بھگوان راج کنور کی عمر دراز کرے۔''

راجہ صاحب نے اپنی ہیرے کی انگوٹھی اتار کر اسے دے دی۔ایک بابا جی کو اسی دعا کے لیے سو بیگھے کی معافی مل گئی۔

ٹھاکر دوارے سے جب وہ گھر آئے تو دیکھا چکر دھر آسن پر بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں اور منورما سامنے کھڑی کھانا پروس رہی ہے ۔اس کے چہرے پر مسرت کی سرخی جھلک رہی تھی ۔کوئی یہ قیاس نہ کر سکتا تھا کہ یہ وہی مریضہ ہے جو ابھی دس منٹ پہلے بستر مرگ پر پڑی ہوئی تھی۔

انیس

راجہ بشال سنگھ نے ادھر کئی سال سے ریاست کے کاموں سے کنارہ کشی اختیار کر لی

تھی۔ منشی بجر دھر اور دیوان صاحب کی بن آئی تھی۔ رعایا کے سکھ دکھ کی فکر اگر کسی کو تھی تو وہ منورما تھی۔ راجہ صاحب کے انصاف اور حق کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ منورما کو پا کر انہیں کسی چیز کی سدھ نہ رہی۔

مگر اس بچے نے آ کر راجہ صاحب کی زندگی میں ایک نئی امنگ ڈال دی۔ اب تک ان کی زندگی کا کوئی مدار نہ تھا۔ دل میں سوال ہوتا تھا۔ کس کے لیے کروں۔ کون رونے والا بیٹھا ہے۔ اب انہیں اپنی زندگی کا مدار مل گیا تھا۔ پھر وہ ریاست کے کاموں سے کنارہ کش کیوں رہتے۔ منشی جی اب تک تو دیوان صاحب سے مل کر اپنا مطلب نکالتے تھے مگر اب وہ کسی کیوں گننے لگے تھے۔ دیوان صاحب اگر منورما کے باپ تھے تو منشی جی ولی عہد کے دادا تھے۔ پھر دونوں میں کون دبتا۔ ملازمین منشی جی کو دیکھتے ہی تھر تھر کانپنے لگتے تھے۔ اگر کوئی عملہ ان کے حکم کی تعمیل میں دیر کرتا تو آپے سے باہر ہو جاتے۔ بات بعد میں کرتے۔ نکال باہر کرنے کی دھمکی پہلے دیتے تھے۔ چکر دھر کے کانوں میں کبھی یہ باتیں پڑ جاتیں تو مارے شرم کے گڑ جاتے تھے۔ وہ آج کل منشی جی سے بہت کم بولتے تھے۔ گھر پر بہت کم جاتے تھے۔ دوستوں سے ملنا جلنا بہت کم کر دیا تھا۔ درحقیقت یہاں کی زندگی ان کے لیے نا قابل برداشت ہو گئی تھی۔ وہ پھر اپنے اسی گوشۂ عافیت میں واپس جانا چاہتے تھے۔ یہاں آئے دن کوئی نہ کوئی بات ایسی ہو جاتی تھی جو دن بھر انہیں مضطرب رکھنے کو کافی ہوتی تھی۔ کئی بار انہیں مجبور ہو کر کارکنوں کو تنبیہ اور نوکروں کی گوشمالی کرنی پڑتی تھی۔ سب سے مشکل مسئلہ یہ تھا کہ یہاں ان کی زندگی کے پرانے اصول ٹوٹتے چلے جاتے تھے۔ وہ بہت کوشش کرتے کہ ضبط کو ہاتھ سے نہ جانے دیں، پر قریب قریب روز ہی ایسے موقعے آ پڑتے تھے کہ انہیں لاچار ہو کر آئین سیاست سے کام لینا پڑتا تھا۔

مگر اہلیا کی حالت بالکل اس کے برعکس تھی۔ بہت دن تک دکھ جھیلنے کے بعد اسے یہ راحت میسر ہوئی تھی اور وہ اس کا لطف اٹھا رہی تھی۔ اپنے پرانے دن اسے بہت جلد بھول گئے۔ اور ان کی یاد دلانے سے اسے ملال ہوتا تھا۔ اس کا طریق معاشرت بالکل تبدیل

ہو گیا تھا۔ وہ اچھی خاصی امیر زادی بن گئی تھی۔ سارے دن عیش و تفریح کے سوا دوسرا کام نہ تھا۔

اب چکر دھر اہلیا سے اپنے دل کی بات کبھی نہ کہتے تھے۔ یہ ثروت ان کی زندگی کو تباہ کیے ڈالتی تھی۔ کیا اہلیا یہ ناز و نعمت چھوڑ کر ان کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گی؟ انہیں خوف ہوتا تھا کہ کہیں وہ اس تجویز کا مذاق نہ اڑائے۔ اس طرح کے کتنے ہی سوالات چکر دھر کے دل میں پیدا ہوتے رہتے تھے۔ اور وہ کسی طرح اپنے طرز عمل کا فیصلہ نہ کر سکتے تھے۔ صرف ایک بات یقینی تھی۔ وہ ان بندشوں میں پڑ کر اپنی زندگی برباد نہ کرنا چاہتے تھے۔ ثروت پر اپنے اصولوں کو قربان نہ کر سکتے تھے۔

ایک دن چکر دھر موٹر پر ہوا کھانے نکلے۔ گرمی کے دن تھے۔ ہوا بند تھی۔ دیہات کی طرف دور نکل گئے۔ جیوں جیوں آگے بڑھتے تھے سڑک خراب ہوتی جاتی تھی۔ دفعتاً انہیں راستے میں ایک بڑا سانڈ دکھائی دیا۔ بہت ہارن بجایا پر سانڈ نہ ہٹا۔ جب قریب آنے پر بھی سانڈ نہ ہٹا تو انہوں نے چاہا کترا کر نکل جائیں مگر سانڈ فوں فوں کرتا سر جھکائے پھر سامنے آ کھڑا ہوا۔ چکر دھر چھڑی ہاتھ میں لے کر نیچے اترے کہ اسے بھگا دیں مگر وہ بھاگنے کے بدلے ان کے پیچھے دوڑا۔ خیریت یہ ہوئی کہ سڑک کے کنارے ایک درخت مل گیا۔ چھڑی پھینکی اور شاخ پکڑ کر لٹک گئے۔ سانڈ ایک منٹ تک تو درخت سے ٹکر لیتا رہا۔ پھر موٹر کے پاس آ کر اسے سینگوں سے پیچھے کی طرف ٹھیلتا ہوا دوڑا۔ کچھ دور کے بعد موٹر سڑک سے ہٹ کر ایک درخت سے ٹکرا گئی۔ اب سانڈ پونچھ اٹھا کر بار بار زور لگاتا ہے۔ پیچھے ہٹ ہٹ کر اس میں ٹکریں مارتا ہے۔ مگر موٹر اپنی جگہ سے نہیں ہلتی۔ تب اس نے موٹر کے بغل میں جا کر اتنے زور سے ٹکر لگائی کہ موٹر الٹ گئی۔ موٹر کے پہیے پھٹ گئے۔ کئی پرزے ٹوٹ گئے۔ پر سانڈ برابر اس پر حملہ کرتا رہا۔

سانڈ نے جب دیکھا کہ دشمن کی دھجیاں اڑ گئیں اور اب وہ شاید پھر نہ اٹھے تو ڈکارتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ تب چکر دھر نیچے اترے اور موٹر کے قریب جا کر دیکھا تو وہ الٹی

پڑی ہوئی تھی۔ موٹر کو سیدھا کرنا ایک آدمی کا کام نہ تھا۔ کسی آدمی کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگے۔ اتفاق سے پورب کی طرف تھوڑی ہی دور پر ایک گاؤں نظر آیا۔ اسی طرف چلے۔ یہ ایک چھوٹا سا، پروا، تھا۔ کسان لوگ بھی تھوڑی ہی دیر پہلے اوکھ کی سینچائی کر کے آئے تھے۔ چکر دھر نے ایک آدمی سے پوچھا تو معلوم ہوا گاؤں کا نام پھینسور ہے اور ریاست جگدیش پور میں ہے۔

چکر دھر: کس کا گاؤں ہے؟

کسان: مہاراج کا۔ آپ کہاں سے آئے ہیں؟

چکر دھر: ہم مہاراج کے آدمی ہیں۔ وہ بدمعاش سانڈ کس کا ہے جو اس وقت سڑک پر گھوما کرتا ہے۔

کسان: یہ تو نہیں جانتے صاحب مگر اس کے مارے ناک میں دم ہے۔

چکر دھر نے سانڈ کے حملہ کا ذکر کر کے کہا۔ ''تم لوگ میرے ساتھ چل کر موٹر کو اٹھا دو۔''

اس پر ایک دوسرا کسان اپنے دروازے سے بولا۔ ''سرکار بھلا رات کو موٹر اٹھوا کر کیا کیجیے گا۔ وہ چلنے لائق تو ہو گی نہیں۔''

چکر دھر: تو تم لوگوں کو اسے ٹھیل کر لے چلنا ہو گا۔

پہلا کسان: سرکار رات بھر یہاں ٹھہریں۔ سویرے ہم گاڑی پر لاد کر موٹر پہنچا دیں گے۔

چکر دھر نے جھلا کر کہا۔ ''کیسی باتیں کرتے ہو جی۔ میں رات بھر یہیں پڑا رہوں گا۔ تم لوگوں کو اسی وقت چلنا ہو گا۔''

چکر دھر کو وہاں کوئی پہچانتا نہ تھا۔ لوگ سمجھے راجاؤں کے یہاں سبھی طرح کے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ ہو گا کوئی۔ اس کے سوا وہ ٹھاکروں کا گاؤں تھا۔ اور ٹھاکر سے مدد کے نام پر جو کام چاہو لے لو۔ بیگار کے نام سے ان کا خون ابل پڑتا تھا۔ کسان نے

کہا۔

''صاحب اس بکھت تو ہمارا جانا نہ ہوگا۔ اگر بیگار چاہت ہو تو وہ اتر کی طرف دوسرا گاؤں ہے۔ وہاں چلے جائیے۔ بہت سے چمار مل جائیں گے۔''

چکر دھر نے غصہ میں آ کر کہا۔ ''میں کہتا ہوں تم کو چلنا پڑے گا۔''

کسان نے اکڑ کر کہا۔ ''تو صاحب اس بات پر تو ہم نہ جائیں گے۔ ہم پاسی چمار نہیں ٹھاکر ہیں۔''

چکر دھر کو ایسا غصہ آیا کہ اسے ٹھوکریں مارتے ہوئے لے چلیں مگر ضبط کر کے بولے۔

''شرافت سے کہتا ہوں تو تم لوگ اڑن کھائیاں بتاتے ہو۔ ابھی کوئی سپاہی آ کر دو گھر کیاں جما دیتا تو سارا گاؤں بھیڑ کی طرح اس کے پیچھے چلا جاتا۔''

کسان نے بے خوفی سے جواب دیا۔ ''سپاہی کیوں گھر کیاں دیتا۔ کوئی چور ہیں۔ ہماری خوشی نہیں جاتے۔ آپ کو جو کرنا ہو کر لیجیے۔''

چکر دھر سے اب ضبط نہ ہو سکا۔ چھڑی ہاتھ میں تھی۔ باز کی طرح کسان پر ٹوٹ پڑے اور دھکا دے کر بولے۔ ''چلتا ہے یا جماؤں دو چار ہاتھ۔''

چکر دھر مضبوط آدمی تھے۔ کسان دھکا کھا کر گر پڑا۔ یوں بھی وہ کرارا آدمی تھا۔ ریجھ پڑتا تو چکر دھر کے چھکے چھوٹ جاتے۔ مگر وہ رعب میں آ گیا۔ سوچا کوئی حاکم ہے۔ نہیں تو اس کی ہاتھ اٹھانے کی ہمت ہی کیسے پڑتی۔ سنبھل کر اٹھنے لگا۔ چکر دھر نے سمجھا شاید اٹھ کر مجھ پر وار کرے گا۔ لپک کر پھر ایک دھکا دیا۔ اس وقت سامنے والے مکان میں سے ایک آدمی لالٹین لیے ہوئے باہر نکل آیا اور چکر دھر کو دیکھ کر تعجب سے بولا۔ ''ارے بھگت جی تم نے یہ بھیس کب سے بدلا۔ مجھے پہچانتے ہو۔ ہم بھی تمہارے ساتھ جیل میں تھے۔'' چکر دھر فوراً اسے پہچان گئے۔ یہ ان کا جیل کا ساتھی دھنا سنگھ تھا۔ چکر دھر کا سارا غصہ ہوا ہو گیا۔ شرماتے ہوئے بولے۔

''کیا تمہارا گھر اسی گاؤں میں ہے۔ دھنا سنگھ؟''

دھنا سنگھ: ہاں اسی گاؤں میں۔ وہ آدمی جسے آپ ٹھوکریں مار رہے تھے میرا سگا بھائی ہے۔ کھانا کھا رہا تھا۔ جب تک اٹھوں تم گرم ہو گئے۔ تم اتنے غصہ ور کب سے ہو گئے۔ کہاں تو داروغہ کو بچانے کے لیے اپنی چھاتی پر سنگین روک لی تھی۔ کہاں آج ذرا سی بات پر اتنے جامے سے باہر ہو گئے۔

چکر دھر پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اپنی صفائی میں ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکے۔ ان کی زندگی کی ساری کمائی جوانہوں نے نہ جانے کتنی قربانیوں کے بعد جمع کی تھی۔ یہاں لٹ گئی۔

دھنا سنگھ نے اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا تو وہ زور زور سے ہائے ہائے کر کے چلا اٹھا۔ دوسری مرتبہ گرنے سے اس کا داہنا ہاتھ اتر گیا تھا۔ دھنا سنگھ نے سمجھا کہ اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا ہے۔ چکر دھر سے دھنا سنگھ کو جو رہا سہا حسن ظن تھا وہ بھی غائب ہو گیا۔ ان کی طرف سرخ آنکھیں کر کے بولا۔ ''کیا کہیں پرانے ساتھی اور اپنے دروازے پر آئے ہو، نہیں تو زندہ نہ لوٹتے۔ تم اتنے بدل کیسے گئے۔ اگر آنکھوں سے نہ دیکھتا تو مجھے کبھی یقین نہ آتا۔ ابھی جا کر مہاراج کی ڈیوڑھی پر فریاد کریں تو تم کھڑے کھڑے نکال دیئے جاؤ۔ بابو چکر دھر سنگھ کا نام تو تم نے سنا ہی ہوگا۔ اب کسی سرکاری آدمی کی مجال نہیں کہ بیگار لے سکے۔ تم بے چارے کس گنتی میں ہو۔ عہدہ پا کر اپنے دن بھول نہ جانا چاہیے۔ تمہیں میں اپنا گورو اور دیوتا سمجھتا تھا۔ مجھے تو تم نے وہ سبق دیا اور آپ لگے غریبوں کو کچلنے۔ منا سنگھ نے اتنا ہی تو کہا تھا کہ رات یہیں ٹھہر جاؤ۔ اس میں کیا برائی تھی۔ بتاؤ اس کے ہاتھ کی کیا دوا کی جائے؟''

چکر دھر نے شرمندہ ہو کر کہا۔ ''دھنا سنگھ مجھے معاف کر دو جو چاہے سزا دو، سر جھکائے کھڑا ہوں۔ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالوں گا۔''

یہ کہتے کہتے ان کا گلا بھر آیا۔ دھنا سنگھ بھی خوش ہو گئے۔ رقت آمیز لہجے میں بولا۔

''ایسی باتیں نہ کرو بھگت جی۔ غصہ میں آدمی کے منہ سے برا بھلا نکل جاتا ہے۔ اس کا

خیال نہ کرو بھیا۔ بھائی کا ناطہ بڑا گہرا ہوتا ہے۔ بھائی چاہے اپنا دشمن بھی ہو، لیکن کون ہے جو بھائی کو ٹھوکریں کھاتے دیکھ کر اپنا غصہ روک سکے۔ کہاں ہے موٹر میں اٹھائے دیتا ہوں۔''

چکر دھر نے روک کر کہا۔ ''جب تک ان کا ہاتھ اچھا نہ ہو جائے گا میں کہیں نہ جاؤں گا۔ ہاں کوئی آدمی ایسا ملے جو یہاں سے جگدیش پور جائے تو اسے میری چٹھی دے دو۔''

دھنا سنگھ: جگدیش پور میں تمہارا کون ہے بھیا؟ کیا ریاست میں نوکر ہو گئے ہو؟

چکر دھر: نوکر نہیں ہوں۔ میں منشی بجر دھر کا لڑکا ہوں۔

دھنا سنگھ نے مرعوب ہو کر کہا۔ ''سرکار ہی بابو چکر دھر سنگھ ہیں۔ دھنیہ بھاگ کہ آج آپ کے درشن ہو گئے۔''

یہ کہتے ہوئے وہ دوڑ کر گیا اور گھر سے ایک چارپائی لا کر دروازے پر ڈال دی۔ پھر لپک کر گاؤں میں خبر دے آیا۔ ایک لمحہ میں گاؤں کے سارے آدمی جمع ہو گئے۔ اور چکر دھر کو نذریں دینے لگے۔ ہر ایک کی زبان پر ان کی تعریف تھی۔ ''جب سے سرکار آئے ہیں ہمارے دن پھر گئے ہیں۔ آپ کے شیل سو بھاؤ کی جتنی تعریف سنتے تھے اس سے کہیں بڑھ کر پایا۔''

دھنا سنگھ نے کہا۔ ''میں نے تو پہچانا ہی نہیں۔ غصہ میں نہ جانے کیا کیا بک گیا۔''

دوسرا اٹھا کر بولا۔ ''سرکار اپنا نام بتا دیتے تو ہم موٹر کو کندھے پر لاد کر لے چلتے۔ آپ کے لیے تو جان حاضر ہے۔''

چکر دھر کو ان تملق سازیوں میں ذرا بھی لطف نہ آیا۔ انہیں اس خیال سے ان پر رحم آیا کہ جس نے ان کے ساتھ اتنی بے انصافی کی اسی کی تعریفوں کے پل باندھ رہے ہیں۔ ذلت کو پی جانا اخلاقی پستی کی آخری حد ہے اور یہی خوشامد سن کر ہم لٹو ہو جاتے ہیں۔ چکر دھر کو اب تعجب ہو رہا تھا کہ مجھے اتنا غصہ آیا کیوں۔ آج انہیں تجربہ ہوا کہ ثروت کتنی مستور اور نامعلوم طریقے سے ان کے اندر سرائیت کرتی جاتی ہے، کتنے مستور اور نامعلوم طریقے

سے ان کی انسانیت کا، اخلاق کا اور اصولوں کا خون ہو رہا ہے۔

چکر دھر کو رات بھر نیند نہ آئی۔ زندگی میں یہ پہلا ہی موقع تھا کہ انہوں نے ایک بے کس کو ایذا پہنچائی تھی۔ جس کی ساری زندگی بے کسوں کی حمایت میں گزری ہو۔ اس میں یہ کایا پلٹ اخلاقی تباہی سے کم نہ تھی۔

چکر دھر اس فکر میں ڈوبے ہوئے تھے اور اہلیا اپنے آراستہ خواب گاہ میں مخملی گدے پر لیٹی انگڑائیاں لے رہی تھی۔ جب چکر دھر نے کمرے میں قدم رکھا تو اہلیا تیوریاں بدل کر بولی۔ ''اب تو رات بھر آپ کے درشن نہیں ہوتے۔''

چکر دھر: تمہیں کچھ خبر بھی ہے۔ آدھ گھنٹہ تک جگاتا رہا جب تم نہ جاگیں تو چلا گیا۔ یہاں آ کر تم سونے میں مشاق ہو گئی ہو۔

اہلیا: کیا میں سچ مچ بہت سوتی ہوں؟

چکر دھر: اچھا ابھی تمہیں اس میں شک ہے۔ گھڑی میں دیکھو آٹھ بج گئے ہیں۔ تم پانچ بجے اٹھ کر گھر کا کام دھندا کرنے لگتی تھیں۔

اہلیا: تب کی باتیں جانے دو۔ اب اتنے سویرے اٹھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

چکر دھر: تو کیا تم عمر بھر یہاں مہمان رہو گی؟

اہلیا نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا مطلب اس کا؟''

چکر دھر: اس کا مطلب یہی ہے کہ ہمیں یہاں آئے بہت دن گزر گئے۔ اب اپنے گھر چلنا چاہیے۔

اہلیا: اپنا گھر کہاں ہے؟

چکر دھر: اپنا گھر وہی ہے جہاں اپنے ہاتھوں کی کمائی ہو۔ سسرال کی روٹیاں بہت کھا چکا۔ کھانے میں تو بہت لذیذ معلوم ہوتی ہیں، لیکن ان سے ضمیر مردہ ہو جاتا ہے۔ اتنے ہی دن میں ہم کچھ سے کچھ ہو گئے۔ یہاں کچھ دن اور رہے تو کم سے کم میں تو کہیں کا نہ رہوں گا۔ کل میں نے ایک غریب کسان کو مارتے مارتے ادھ مرا کر دیا۔ اس کا قصور صرف اتنا

تھا کہ وہ میرے ساتھ آنے پر راضی نہ ہوتا تھا۔

اہلیا: یہ کوئی خاص بات نہیں۔ گنواروں کے اجڈ پن پر کبھی غصہ آ ہی جاتا ہے۔ میں ہی یہاں لونڈیوں پر دن بھر جھلاتی رہتی ہوں۔ مگر مجھے تو کبھی یہ خیال ہی نہ آیا کہ گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔

چکر دھر: تمہارا گھر ہے تم رہ سکتی ہو لیکن میں نے تو جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

اہلیا نے غرور سے سر اٹھا کر کہا۔ ''تم نہ رہو گے تو یہاں رہ کر مجھے کیا لینا ہے۔ جب چاہو لے چلو۔ ہاں دادا جی سے پوچھ لو۔ مگر اتنا سوچ لو کہ ہم لوگوں کے جاتے ہی یہاں کا سارا انتظام خراب ہو جائے گا۔ تھوڑے ہی دنوں میں ریاست برباد ہو جائے گی اور ایک دن بے چارے منو کو پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔''

چکر دھر سمجھ گئے کہ اگر میں اصرار کروں گا تو یہ میرے ساتھ جانے پر آمادہ ہو جائے گی جب ثروت اور وفا دونوں کا مقابلہ ہو گا تو وہ کس طرف مائل ہو گی۔ اس میں ذرا برابر بھی شک نہ تھا، لیکن وہ اسے اس سخت آزمائش میں ڈالنا مناسب نہ سمجھتے تھے۔ اصرار سے مجبور ہو کر وہ اس کے ساتھ چلی بھی گئی تو کیا؟ جب اسے کوئی تکلیف ہو گی تو دل میں جھلائے گی اور بات بات پر کڑھے گی اور منو کو یہاں نہیں چھوڑ سکتی۔ راجہ صاحب تو شاید اس کی جدائی میں جان دے دیں گے۔ بیٹے کو چھوڑ کر اہلیا کبھی جانے پر تیار نہ ہو گی۔ اور اگر گئی بھی تو بہت جلد لوٹ آئے گی۔

چکر دھر بہت دیر تک انہی خیالوں میں ڈوبے رہے۔ آخر میں انہوں نے بغیر کسی سے کچھ کہے سنے چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے سوا گلو خلاصی کی کوئی صورت نہ تھی۔ اپنے کمرے میں جا کر دو چار کپڑے اور کتابیں سمیٹ کر رکھ دیں۔ کل اتنا ہی سامان تھا جو ایک آدمی آسانی سے ہاتھ میں لٹکائے لے جا سکے۔ انہوں نے رات کو چپکے سے بقچہ اٹھا کر چلے جانے کا فیصلہ کیا۔

سفر کی تیاری کر کے اور اپنے دل کو سمجھا کر چکر دھر اپنی خواب گاہ میں نیند کا بہانہ کرنے

لگے۔وہ چاہتے تھے کہ جب سب سو جائیں تو چپکے سے اپنا بقچہ اٹھاؤں اور اپنا راستہ لوں۔ مگر نیند کی متوالی اہلیا کی آنکھوں میں آج نیند کوسوں دور تھی۔وہ کوئی نہ کوئی ذکر چھیڑ کر باتیں کرتی جاتی تھی۔یہاں تک کہ رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تو چکر دھر نے کہا۔''بھئی اب مجھے سونے دو۔آج تمہاری نیند کہاں بھاگ گئی؟''انہوں نے چادر اوڑھائی اور کروٹ بدل کر لیٹ گئے۔گرمی کے دن تھے۔کمرے میں پنکھا چل رہا تھا پھر بھی گرمی معلوم ہوتی تھی۔روزکواڑ کھلے رہتے تھے۔آج اہلیا نہ جانے کیوں بہت محتاط ہوگئی تھی۔ پگلی سمجھتی نہیں جانے والے کو کون روک سکتا ہے۔

رات بھیگ چکی تھی۔ذرا دیر میں اہلیا سرمست خواب ہوگئی۔چکر دھر کا مہر پذیر دل اہلیا کی اس احتیاط پر بے تاب ہوگیا۔اس خیال سے ان کا کلیجہ پھٹا جاتا تھا کہ جب صبح اہلیا انہیں نہ پائے گی تو اس کی کیا حالت ہوگی۔

چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔چکر دھر نے اٹھ کر دروازوں کو ٹٹولنا شروع کیا۔مگر سمتوں کا اندازہ خطا کر رہا تھا۔آخر انہوں نے دیواروں کو ٹٹول کر بجلی کا بٹن ڈھونڈ نکالا اور بتی جلا دی۔چپکے سے باہر کے کمرے میں آئے۔اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور باہر نکل گئے۔

باہر آ کر چکر دھر نے محل کی طرف دیکھا۔بے شمار کھڑکیوں اور دریچوں سے بجلی کی شفاف روشنی جھانک رہی تھی۔انہیں وہ محل ہزاروں آنکھوں والے دیو کی طرح معلوم ہوا۔جس نے ان کی زندگی کو خاک میں ملا دیا تھا۔وہ قدم بڑھاتے ہوئے آگے چلے۔وہ دن نکلنے سے پہلے اتنی دور نکل جانا چاہتے تھے کہ پھر انہیں کوئی پا نہ سکے۔دن نکلنے میں اب بہت دیر بھی نہ تھی۔تاروں کی روشنی ماند پڑتی جا رہی تھی۔چکر دھر نے اور تیزی سے قدم بڑھا دیئے۔

اچانک انہیں سڑک کے کنارے ایک کنویں کے پاس کئی آدمی بیٹھے دکھائی دیئے۔ ان کے درمیان ایک لاش رکھی ہوئی تھی۔کئی آدمی لکڑی کے کندے لیے پیچھے آ رہے تھے۔چکر دھر پوچھنا چاہتے تھے،کون مر گیا؟ کہ دھنا سنگھ کی آواز پہچان کر وہ سڑک ہی پر

رک گئے۔اس نے پہچان لیا تو بڑی مشکل ہوگی۔ دھنا سنگھ کہہ رہا تھا۔ ''قضا آ گئی تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ بابو جی کے ہاتھ میں کوئی ڈنڈا بھی تو نہیں تھا۔ دو چار گھونسے مارے ہوں گے اور کیا۔ مگر اس دن سے پھر بے چارہ اٹھ نہ سکا۔''

دوسرے آدمی نے کہا۔ ''جگہ بے جگہ کی بات ہے۔ منا کو بے جگہ چوٹ لگ گئی۔''

دھنا سنگھ: بابو جی سنیں گے تو انہیں بہت رنج ہوگا۔ جیل میں ہم انہیں بھگت جی کہا کرتے تھے۔

ایک بوڑھا آدمی بولا۔ ''بھیا جیل کی بات دوسری تھی، تب دیاوان رہے ہوں گے۔ راج پا کر دیاوان رہیں تو جانوں۔''

دھنا سنگھ: دادا وہ راج پا کر بھول جانے والے آدمی نہیں ہیں۔ تم نے دیکھا یہاں سے جاتے ہی جاتے معافی دلا دی۔

بوڑھا: ارے پگلے جان کا بدلہ کہیں معافی سے چکتا ہے؟ تم بابو جی کو دیاوان کہتے ہو۔ میں سو ہتیاروں کا ایک ہتیارا کہتا ہوں۔ راجہ ہیں اسی لیے بچے جاتے ہیں۔ دوسرا ہوتا تو پھانسی پر لٹکا دیا جاتا۔

چکر دھر وہاں ایک لمحہ بھی اور کھڑے نہ رہ سکے۔ ان آدمیوں کے سامنے جانے کی ہمت نہ پڑی۔

پانچ سال گزر گئے پر چکر دھر کا پتہ نہیں۔ پھر وہی گرمی کے دن ہیں۔ دن کو لو چلتی ہے۔ رات کو انگارے برستے ہیں، مگر اہلیا کو اب نہ پنکھے کی ضرورت ہے نہ خس کی ٹٹیوں کی۔ اس دکھیا کو اب رونے کے سوا دوسرا کام نہیں ہے۔ وہ اپنے آپ کو کوستی ہے۔ کہ وہ چکر دھر کے ساتھ کیوں نہ چلی گی؟

شنکھ دھر اس سے پوچھتا رہتا ہے۔ ''اماں بابو جی کب آئیں گے۔ وہ کیوں چلے گئے اماں جی؟ رانی اماں کہتی ہیں وہ آدمی نہیں دیوتا ہیں تب تو لوگ ان کی پوجا کرتے ہوں گے۔''

اہلیا کے پاس ان سوالات کا جواب رونے کے سوا اور کیا تھا۔ شنکھ دھر کبھی کبھی اکیلا بیٹھ کر روتا ہے اور سوچتا ہے کہ بابو جی کے پاس کیسے جاؤں۔ باپ کا ذکر سنتے ہی اس کی طبیعت کبھی سیر نہیں ہوتی۔ وہ روز اپنی دادی کے پاس جاتا ہے اور وہاں ان کی گود میں بیٹھا ہوا چکر دھر کا ذکر سنتا ہے۔ نرملا دن بھر اس کی راہ دیکھا کرتی ہے۔ اسے دیکھتے ہی نہال ہو جاتی ہے۔ مگر اہلیا کے نام سے اسے نفرت ہے۔ اس کا منہ بھی وہ نہیں دیکھنا چاہتی۔

منشی جی کو اب ریاست سے ایک ہزار روپیہ وظیفہ ملتا ہے۔ راجہ صاحب نے انہیں ریاست کے کاموں سے سبکدوش کر دیا ہے۔ اس لیے وہ زیادہ تر گھر ہی پر رہتے ہیں۔ ذوق شراب تو ثروت کے ساتھ نہیں بڑھا بلکہ اور کم ہو گیا ہے، لیکن نغمہ سے دل چسپی بڑھ گئی ہے۔ ان کی زندگی کا سب سے مبارک موقع وہ ہوتا ہے جب وہ شنکھ دھر کو گود میں لیے ہوئے محلے بھر کے لڑکوں میں مٹھائیاں اور پیسے تقسیم کرتے ہیں۔

ایک دن شنکھ دھر نو بجے ہی آ پہنچا۔ نرملا اس وقت تلسی کو پانی چڑھا رہی تھی۔ جب وہ پوجا کر کے آئی۔ شنکھ دھر نے پوچھا۔ ''دادی جی تم پوجا کیوں کرتی ہو؟''

نرملا نے شنکھ دھر کو گود میں لے کر کہا۔ ''بیٹا بھگوان سے مناتی ہوں کہ میری مرادیں پوریں کریں۔''

شنکھ دھر: بھگوان سب کے دل کی باتیں جانتے ہیں؟

نرملا: ہاں بیٹا بھگوان سب کچھ جانتے ہیں۔

دوسرے دن شنکھ دھر نے بڑے سویرے اشنان کیا، لیکن اشنان کر کے وہ ناشتہ کرنے نہ گیا۔ نہ جانے کہاں چلا گیا۔ اہلیا ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ کہاں چلا گیا؟ منورما کے پاس آ کر دیکھا وہاں بھی نہ تھا۔ دونوں گھبرائیں کہ لڑکا نہا کر کہاں چلا گیا۔ چاروں طرف تلاش ہونے لگی۔ دونوں باغیچہ کی طرف دوڑی گئیں۔ وہاں پرلے سرے پر ایک گوشہ میں اس کی جھلک دکھائی دی۔ دونوں دبے پاؤں گئیں اور ایک درخت کی آڑ میں کھڑی ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔ شنکھ دھر تلسی کے چبوترے کے سامنے آسن مارے آنکھیں بند کیے

دھیان لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے کچھ پھول پڑے تھے۔ ایک لمحہ میں اس نے آنکھیں کھولیں۔ کئی بار چبوترے کا طواف کیا اور گھر کی طرف چلا۔ دونوں عورتیں آڑ سے نکل کر سامنے کھڑی ہو گئیں۔ شنکھ دھر انہیں دیکھتے ہی شرما گیا۔

منورما نے پوچھا۔ ''وہاں کیا کرتے تھے بیٹا؟''

شنکھ دھر: کچھ تو نہیں یوں ہی گھومتا تھا۔

منورما: نہیں۔ کچھ تو کر رہے تھے۔

شنکھ دھر: جائیے آپ سے مطلب۔

اہلیا: تمہیں نہ بتائے گا۔ میں اس کی اماں ہوں۔ مجھے بتائے گا۔ میرے کان میں کہہ دو بیٹا۔ میں کسی نے نہ کہوں گی۔

شنکھ دھر نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ''کچھ نہیں۔ میں بھگوان سے مناتا تھا کہ بابو جی جلد آئیں۔''

بھولے بچے کی یہ فرزندانہ سعادت مندی دیکھ کر دونوں دیویاں رونے لگیں۔

بیس

ادھر کچھ دنوں سے لونگی تیرتھ کرنے چلی گئی تھی۔ گرسیوک سنگھ ہی اس مذہبی عقیدت کے باعث تھے۔ جب سے وہ گئی تھی دیوان صاحب دیوانے ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ گرسیوک سنگھ کو بھی ماننا پڑتا تھا کہ لونگی کا گھر میں رہنا دیوان صاحب کے لیے کتنا ضروری ہے۔ دیوان صاحب کا ذوق مئے نوشی روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ کھانا وہ بہت کم کھاتے تھے۔ لونگی ان کی خوراک کا معقول انتظام کرتی رہتی تھی۔ فرائض زوجیت کا وہ زریں اصول جو چالیس سال کی عمر کے بعد شوہر کی شکم پروری کا حامی ہے، ہمیشہ اس کے پیش نظر رہتا تھا۔ وہ کہا کرتی تھی۔ گھوڑے اور مرد کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔ صرف انہیں راتب ملنا چاہیے۔ ٹھاکر صاحب کو اب لونگی کے نام سے نفرت ہے۔ اسے خطوں میں لکھا کرتے ہیں۔ تم نے میری زندگی خراب کر دی۔ میری دنیا اور آخرت دونوں ہی گنوا دیں۔ شاید

لونگی کو جلانے کے لیے ہی ٹھاکر صاحب سبھی کام لونگی کی مرضی کے خلاف کرتے تھے اور اسے اس کی اطلاع بھی دے دیتے تھے۔ آخر میں یہ بھی لکھ دیتے تھے کہ اب تمہارے یہاں آنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ میری بہو تم سے کہیں زیادہ اچھی خدمت کرتی ہے۔ ہر ایک خط میں وہ اپنی صحت کا چرچا ضرور کرتے تھے۔ ان کا ہاضمہ اب صحیح ہو گیا تھا۔ خون کے بڑھ جانے سے جتنے امراض بڑھ جاتے ہیں، ان کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔

دیوان صاحب کا ہاضمہ صحیح ہو گیا ہو، پر عقل ضرور کمزور ہو گئی تھی۔ وہ اب ایسی غلطیاں کرتے تھے کہ راجہ صاحب کو ان کا لحاظ کرنے پر بھی بار بار تنبیہ کرنی پڑتی تھی۔ وہ مستعدی، وہ دانائی، وہ معاملہ فہمی جس نے انہیں چپراسی سے دیوان بنایا تھا، اب ان کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ گرسیوک سنگھ کو بھی شاید اب معلوم ہونے لگا تھا کہ والد کی آڑ میں کوئی دوسری ہی طاقت ریاست کا انتظام کرتی تھی۔

ایک دن انہوں نے دیوان صاحب سے پوچھا۔ ''لونگی کب تک آویں گی؟''

دیوان صاحب نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ ''اس کے یہاں آنے کی تو کوئی خاص ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔''

اسی دن بھائی بہن میں بھی اسی معاملے پر گفتگو ہوئی۔ منورما نے کہا۔ ''بھیا کیا تم نے لونگی اماں کو بلا نہیں لیا۔ بابو جی کی حالت دیکھ رہے ہو کہ نہیں، جب سے اماں جی کا انتقال ہوا لونگی نے دادا پر حکومت کی ہے۔ میں نے کسی بیاہتا عورت میں یہ شوہر پروری نہیں دیکھی۔ اگر دادا کو زندہ رکھنا چاہتے ہو تو جا کر لونگی اماں کو لے آؤ۔''

گرسیوک سنگھ: میرا جانا تو مشکل ہے۔

منورما: کیوں۔ کیا اس میں آپ کی توہین ہوگی؟

گرسیوک سنگھ: وہ سمجھے گی۔ آخر انہی کو غرض پڑی۔ آ کر چڑھ جائے گی۔

منورما: اچھی بات ہے۔ تم نہ جاؤ لیکن میرے جانے میں تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے؟

گرسیوک سنگھ: تم جاؤ گی؟

منورما: کیوں! میں کیا ہوں۔ کیا میں بھول گئی ہوں کہ لونگی اماں ہی نے مجھے اپنا دودھ پلا کر پالا ہے۔ اگر وہ اس گھر میں آ کر رہتی تو میں اپنے ہاتھوں سے اس کے پیر دھوتی۔

گرسیوک سنگھ شرمندہ ہو گئے۔ گھر جا کر انہوں نے دیکھا کہ دیوان صاحب لحاف اوڑھے لیٹے تھے۔ پوچھا۔

''آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

دیوان صاحب کی لال آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ بولے۔ ''کچھ نہیں جی۔ ذرا سردی لگ رہی تھی۔''

گرسیوک سنگھ: آپ کی منشا ہو تو جا کر لونگی کو بلا لاؤں؟

دیوان صاحب: تم .....نہیں۔ تم اسے بلانے کیا جاؤ گے۔ کوئی ضرورت نہیں۔ ایسی کہاں کی امیر زادی ہے۔

دوسرے دن دیوان صاحب کو بخار ہو آیا۔ بخار اتنی شدت کا تھا کہ گرسیوک نے گھبرا کر ڈاکٹر کو بلایا۔ منورما بھی خبر پاتے ہی دوڑی ہوئی آئی۔ اس نے آتے ہی آتے گرسیوک سے کہا۔ ''میں نے کل آپ سے کہا تھا کہ جا کر لونگی کو بلا لائیے، پر آپ نہ گئے۔ میں ان کی دیکھ بھال کرتی ہوں۔ آپ جا کر لونگی کو لے آئیے۔''

دیوان صاحب منورما کو دیکھ کر بولے۔ ''آؤ نورا۔ مجھے آج بخار آ گیا۔ گرسیوک کہہ رہا تھا کہ تم لونگی کو بلانے جا رہی ہو۔ بیٹی اس میں تمہاری توہین ہے۔ بھلا تم اسے بلانے جاؤ گی تو دنیا کیا کہے گی۔''

''دنیا جو چاہے کہے۔ میں نے بھیا کو بھیج دیا ہے۔''

دیوان صاحب: سچ؟ یہ تم نے کیا کیا؟ لونگی کبھی نہ آئے گی۔

منورما: آئے گی کیوں نہیں۔ نہ آئے گی تو میں جا کر اسے منا لاؤں گی۔

دیوان صاحب کا مرجھایا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔ بجھی ہوئی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔ خوش ہو کر

بولے۔

''نورا سچ مچ تم رحم کی پتلی ہو۔ دیکھو اگر لونگی آئے اور میں نہ رہوں تو اسے کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ اس نے میری بڑی خدمتیں کی ہیں۔ میں کبھی اس احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔ میں چاہوں تو اپنی ساری جائیداد اس کے نام لکھ سکتا ہوں۔ یہ سب جائیداد میری ہی پیدا کی ہوئی ہے۔ لیکن وہ چڑیل میری جائیداد کا ایک تنکا بھی نہ چھوئے گی۔ وہ صرف عزت کی بھوکی ہے۔ کوئی اس سے عزت کے ساتھ بولے۔ لوٹ لے۔ وہ اس گھر کی مالکن بن کر بھوکی مر جانا پسند کرے گی لیکن خادمہ بن کر سونے کا لقمہ بھی نہ کھائے گی۔ گرسیوک نے آج تک اسے نہ پہچانا۔ نورا جس دن سے وہ گئی ہے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے جسم سے روح ہی غائب ہو گئی۔ مجھے اپنے اوپر ذرا بھی بھروسہ نہیں رہا۔ تمہیں اپنے بچپن کی یاد آتی ہے؟''

منورما: بہت پہلے کی باتیں تو یاد نہیں ہیں، لیکن اپنی بیماری کی یاد ہے۔

دیوان صاحب نے رقت آمیز لہجہ میں کہا۔ ''اس سے پہلے کا ذکر ہے۔ نورا۔ جب گرسیوک تین سال کا تھا اور تمہاری اماں تمہیں سال بھر کا چھوڑ کر چل بسی تھیں۔ میں پاگل ہو گیا تھا۔ یہی جی چاہتا تھا کہ خودکشی کر لوں۔ اس حالت میں لونگی نے میری جان بچائی۔ مجھے اس کی بے غرض خدمت اور جاں نثاری نے موہ لیا۔ تمہاری ماں بھی تم دونوں بھائی بہن کی پرورش اتنے دل و جان سے نہ کر سکتی۔ گرسیوک کی بیماری کی یاد تمہیں کیا آئے گی۔ خون کے دست آتے تھے اور تل تل پر۔ اس کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ روتا تو اس طرح جیسے کراہ رہا ہو۔ یہ لونگی ہی تھی جس نے اسے موت کے منہ سے نکال لیا۔ کوئی ماں اپنے بچے پر اس طرح جان نہ دیتی اور آج گرسیوک اسے گھر سے نکال رہا ہے۔ سمجھتا ہے کہ لونگی کسی لالچ سے مجھے گھیرے ہوئے ہے۔ احمق یہ نہیں سوچتا کہ جس وقت لونگی اس کی ہڈیاں لے کر رویا کرتی تھی۔ تو دولت کہاں تھی۔ سچ پوچھو تو یہاں لکشمی بھی لونگی کے ساتھ ہی آئی ہے۔ بلکہ لکشمی لونگی کی شکل میں آئی۔ کیوں نورا! میرے سرہانے کون کھڑا ہے؟

کوئی باہری آدمی ہے؟ کہہ دو یہاں سے چلا جائے۔''

منورما: یہاں تو میرے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ ڈاکٹر کو بلاؤں؟

دیوان صاحب: میری دوا لونگی کے ہی پاس ہے۔ اس ستی کو کیسا اقبال تھا۔ جب تک وہ رہی میرے سر میں کبھی درد نہیں ہوا۔ میری حماقت دیکھو کہ جب اس نے تیرتھ جاترا کی خواہش ظاہر کی تو میرے منہ سے ایک بار بھی نہ نکلا کہ مجھے کس پر چھوڑے جاتی ہو۔ اگر میں یہ کہہ سکتا تو وہ کبھی نہ جاتی۔

یہ کہتے کہتے دیوان صاحب پھر چونک پڑے اور دروازے کی طرف خوف کی نظروں سے دیکھ کر بولے۔

''یہ کون اندر آیا ہے نورا! یہ لوگ کیوں مجھے گھیرے ہوئے ہیں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔ لیٹا ہوا باتیں کر رہا ہوں مزے سے۔''

منورما نے امنڈنے والے آنسو نگل کر پوچھا۔''کیا آپ کا جی پھر گھبرا رہا ہے؟''

دیوان صاحب: وہ کچھ نہیں تھا نورا۔ میں نے اپنی زندگی میں اچھے کام بہت کم کیے ہیں اور برے کام بہت زیادہ۔ اچھے کام جتنے کیے وہ لونگی نے کیے۔ برے کام جتن کیے ہیں وہ میرے ہیں۔ ان کی سزا کا سزاوار میں ہوں۔ لونگی کے کہنے پر چلتا تو آج فرشتہ ہوتا۔ ایک بات تم سے پوچھوں نورا۔ بتاؤ گی۔ تم اپنے مقدر سے خوش ہو؟

منورما آنسوؤں کے سیلاب کو روکے ہوئے تھی۔ اس کو بچپن کے گھر میں بھی آج ایک وحشت سی معلوم ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آفتاب کی روشنی زرد ہو گئی ہے۔

دیوان صاحب چھت کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے تھے۔ گویا ان کی آنکھیں اسباب کے اس پار پہنچ جانا چاہتی ہوں۔ یکا یک انہوں نے کہا۔''نورا! ذرا قلم دوات لے کر میرے قریب آ جاؤ۔ نورا کوئی اور تو یہاں نہیں ہے؟ میری وصیت لکھ لو۔ گرسیوک کی لونگی سے نہ بنے گی۔ میرے بعد وہ اسے ستائے گا۔ میں اپنی سب جائیداد لونگی کو دے جاتا

ہوں۔ جائیداد کے لالچ سے گرسیوک اس سے دبے گا۔ یہ وصیت تم اپنے ہی پاس رکھنا۔ ضرورت پڑنے پر اس سے کام لینا۔''

منورما اندر جا کر رونے لگی۔ آنسوؤں کا سیلاب اس سے روکے نہیں رک رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں راجہ صاحب آ پہنچے۔ اہلیا بھی ان کے ساتھ تھی۔ منشی بجر دھر کو بھی اڑتی ہوئی خبر ملی۔ دوڑے آئے۔ ریاست کے صدہا ملازم جمع ہو گئے۔ مگر دیوان صاحب کی آنکھیں بند تھیں۔

یکا یک دروازے پر ایک بگھی آ کر رکی اور اس میں سے ایک عورت اتر کر گھر میں داخل ہوئی۔ شور مچ گیا۔ آ گئی آ گئی، یہ لونگی تھی۔ اتنے آدمیوں کو جمع دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا۔ اس کے کمرے میں آتے ہی لوگ ہٹ گئے۔ صرف منورما اور اس کی بھابی اور اہلیا رہ گئے۔ لونگی نے دیوان صاحب کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''پران ناتھ! کیا مجھے اکیلے چھوڑ جاؤ گے؟''

دیوان صاحب کی آنکھیں کھل گئیں۔ ان آنکھوں میں درد اور محبت کی ایک دنیا چھپی ہوئی تھی۔ انہوں نے دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا۔ ''لونگی اور پہلے کیوں نہ آئیں؟''

لونگی نے دونوں پھیلے ہوئے ہاتھوں کے بیچ میں اپنا سر رکھ دیا اور اس بے جان، قریب المرگ ہستی کے آغوش میں اسے روحانی تقویت، اعتماد اور آسودگی کا احساس ہوا۔ آج اسے معلوم ہوا کہ جس کے قدموں پر میں نے اپنے آپ کو نثار کیا تھا۔ جس کے ہاتھوں میں میں نے اپنی تقدیر سونپی تھی۔ وہ آخری دم تک میرا رہا۔ یہ غمناک تسکین بھی کتنی حیات بخش اور کتنی سکون انگیز تھی۔

وہ انہی خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی کہ منورما کا رونا سن کر چونک پڑی اور دیوان صاحب کے چہرہ کی طرف دیکھا۔ تب اس نے اپنے مالک کے پیروں پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایک ہی لمحہ میں سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔

ٹھاکر ہرسیوک سنگھ کے آخری مراسم سے فرصت پانے کے بعد ایک دن لونگی نے

اپنے کپڑے لتے باندھنے شروع کیے۔ اس کے پاس روپے پیسے جو کچھ تھے سب کچھ گرسیوک کو سونپ کر بولی۔

''بھیا۔ میں اب کسی گاؤں میں جا کر رہوں گی۔ یہاں مجھ سے نہیں رہا جاتا۔''

فی الواقع لونگی سے اب اس گھر میں نہ رہا جاتا تھا۔ گھر کی ایک ایک چیز اسے کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ پچیس برس تک اس گھر کی رانی رہنے کے بعد اب وہ کسی کی دست نگر نہ بن سکتی تھی۔ بیوگی کے رنج کے ساتھ یہ خیال کہ وہ کسی دوسرے کی روٹیوں پر پڑی ہو، اس کی قوت برداشت سے باہر تھا۔ حالانکہ گرسیوک اب پہلے سے کہیں زیادہ ان کا لحاظ کرتے تھے اور کوئی ایسی بات نہ ہونے دیتے کہ جس سے اسے رنج ہو۔ پھر بھی کبھی کبھی ایسی باتیں ہو ہی جاتی تھیں جو اس کی بے کسی کی یاد دلا دیتی تھیں۔ اس لیے اب وہ یہاں سے جا کر کسی دیہات میں رہنا چاہتی ہے۔ آخر جب ٹھاکر صاحب نے اس کے نام کچھ نہیں لکھا۔ اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کے پھینک دیا۔ تو وہ یہاں کیوں دوسروں کی دست نگر ہو کر پڑی رہے۔ اسے اب ایک ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے اور ایک ٹکڑے روٹی کے سوا اور کچھ نہ چاہیے۔

گرسیوک نے کہا۔ ''آخر سنیں تو کہاں جانے کا ارادہ ہے؟''

لونگی: جہاں بھگوان لے جائیں گے۔ وہاں چلی جاؤں گی۔ کوئی میکہ یا سسرال ہے جس کا نام بتاؤں!

گرسیوک: مگر یہ بھی سوچا ہے کہ تمہارے چلے جانے سے ہماری کتنی بدنامی ہوگی۔ دنیا یہی کہے گی کہ ان سے ایک بیوہ کی پرورش نہ ہو سکی۔ میرے لیے کہیں منہ دکھانے کی جگہ نہ رہے گی۔ تمہیں اس گھر میں جو شکایت ہو مجھ سے کہو۔ اگر میری طرف سے اس کے دور کرنے میں ذرا بھی غفلت ہو تو پھر تمہیں اختیار ہے جو چاہے کرنا۔

لونگی: کیا باندھ کر رکھو گے؟

گرسیوک: ہاں باندھ کر رکھوں گا۔

اگر لمحہ بھر لونگی کو گرسیوک سنگھ کی کوئی بات پسند نہ آئی تو ان کی بے جا ضد تھی۔ لونگی کا دل مسرت سے کھل اٹھا۔ اس نے ذرا تیز ہو کر کہا۔ ''باندھ کر کیوں رکھو گے؟ کیا تمہاری زر خرید ہوں۔''

گرسیوک: ہاں زر خرید ہو۔ میں نے نہیں خریدا تو میرے باپ نے تو خریدا ہے۔ زر خرید نہ ہوتیں تو تیس سال یہاں رہتیں کیسے؟ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر تم نے گھر سے باہر قدم نکالا تو چاہے دنیا مجھے بدنام کرے گی، میں تمہارے پاؤں توڑ کر رکھ دوں گا۔ تمہارے نام کے ساتھ میری اور میرے باپ کی عزت بندھی ہوئی ہے۔

لونگی کے جی میں آیا کہ گرسیوک کے قدموں پر سر رکھ دوں اور سینے سے لگا کر کہوں۔ ''بیٹا میں نے تو تجھے گود میں کھلایا ہے۔ تجھے چھوڑ کر بھلا کہیں جا سکتی ہوں، لیکن اس نے مصنوعی غصے کے ساتھ کہا۔ ''یہ تو اچھی دل لگی ہوئی۔ یہ مجھے باندھ کر رکھیں گے۔''

گرسیوک تو جھلائے ہوئے باہر چلے گئے اور لونگی اپنے کمرے میں جا کر خوب روئی۔ کیا گرسیوک کسی مہری سے کہہ سکتے تھے 'ہم تمہیں باندھ کر رکھیں گے' کبھی نہیں۔

دفعتاً منورما نے کمرے میں قدم رکھا اور لونگی کو سر میں تیل ڈلواتے دیکھ کر بولی۔

''کیسی طبیعت ہے اماں۔ کیا سر میں درد ہے؟''

''نہیں بیٹی۔ جی تو اچھا ہے۔ آؤ بیٹھو۔''

منورما نے مہری سے کہا۔ ''تم جاؤ۔ تیل میں ڈالے دیتی ہوں۔ دروازے پر کھڑی ہو کر سننا نہیں۔ دور چلی جانا۔''

مہری چلی گئی تو منورما سر دبانے بیٹھی تو لونگی نے ہاتھ پکڑ لیا اور اس سے بولی۔ ''نہیں بیٹا۔ تم رہنے دو۔ درد نہیں ہے۔ نہیں میں نہیں مانوں گی۔ کوئی دیکھے تو کہے گا بڑھیا پاگل ہو گئی ہے۔ رانی سے سر دبوا رہی ہے۔''

منورما نے سر دباتے ہوئے کہا۔ ''رانی جہاں ہوں۔ وہاں ہوں۔ یہاں تو تمہاری گود کی کھلائی ہوئی نورا ہوں۔ آج بھیا یہاں سے جا کر تمہارے اوپر بہت بگڑ رہے تھے۔ اس

کی ٹانگ توڑ دوں گا۔ گردن کاٹ دوں گا۔ کتنا پوچھا کچھ بتاؤ بات کیا ہے؟ مگر غصے میں کچھ سنا ہی نہیں۔ بھائی ہے تو کیا ہوا۔ مگر ان کی زیادتیاں مجھ سے نہیں دیکھی جاتیں۔ دادا جی ان کی نیت کو پہلے ہی تاڑ گئے تھے۔ میں نے آج تک تم سے نہیں کہا اماں جی۔ مگر آج ان کی بدزبانی سن کر کہتی ہوں کہ دادا جی اپنی ساری جائیداد تمہارے نام لکھ گئے ہیں۔''

لونگی پر اس مژدہ کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ اس کے چہرے پر خوشی یا غرور کا نشان تک نہ تھا۔

منورما نے پھر کہا۔ ''میرے پاس ان کی لکھی ہوئی وصیت رکھی ہوئی ہے اور میں ہی اس کی گواہ ہوں۔ جب یہ حضرت وصیت دیکھیں گے تو آنکھیں کھلیں گی۔''

لونگی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''بیٹی تم یہ وصیت نامہ جا کر انہیں دے دو۔ تمہارے دادا نے ناحق یہ وصیت لکھی ہے۔ میں ان کی جائیداد کی بھوکی نہیں ہوں اور ایشور کو گواہ کر کے کہتی ہوں کہ میری جیسی تقدیر بہت کم عورتوں کو نصیب ہوتی ہے۔ میں ان کے پریم کی دولت پا کر ہی خوش ہوں۔ گوسیوک کو میں نے گود میں کھلایا ہے۔ پالا پوسا ہے۔ وہ میرے مالک کا بیٹا ہے۔ اس کے سامنے کی تھالی میں نہیں کھینچ سکتی۔ یہ کاغذ پھاڑ کر پھینک دو۔ گر سیوک اگر اپنے باپ کا بیٹا ہے تو میری بے قدری نہ کرے گا۔ وہ مجھے مانے یا نہ مانے۔ میں اسے اپنا ہی سمجھتی ہوں۔ تم سرہانے بیٹھی میرا سر دبا رہی ہو۔ کیا دولت سے کبھی اتنا سکھ مل سکتا ہے؟ گر سیوک کے منہ سے 'اماں' سن کر مجھے وہ خوشی ہوگی جو سنسار کی رانی بن کر نہیں ہو سکتی۔''

یہ کہتے کہتے لونگی کی آنکھیں پر آب ہو گئیں۔ منورما اس کی طرف عقیدت، غرور، تعجب، احترام کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی گویا وہ کوئی رانی ہو۔

اکیس

جگدیش پور کے ٹھاکر دوارے میں اکثر سادھو مہاتما آتے رہتے ہیں۔ شنکھ دھر ان کے پاس جا بیٹھتا اور ان کی باتیں سنتا۔ اس کے پاس چکر دھر کی جو تصویر تھی، اس سے ان

کی صورت کا مقابلہ کرتا۔ پر اس شکل کا کوئی سادھوا سے نہ دکھائی دیتا تھا۔

ایک شنکھ دھر بھی لونگی کے پاس گیا۔ لونگی بڑی دیر تک اپنی تیرتھ یاترا کی سرگزشت سناتی رہی۔ شنکھ دھر نے اس کی باتیں غور سے سننے کے بعد پوچھا۔ ''کیوں دائی۔ تمہیں سادھوسنیاسی بہت ملے ہوں گے؟'' لونگی نے کہا۔ ''ہاں بیٹا ملے کیوں نہیں۔ ایک مہاتما تو ایسے ملے کہ تمہارے بابو جی سے ہو بہو صورت ملتی تھی۔''

شنکھ دھر نے بے صبری سے پوچھا۔ ''جٹا بڑی بڑی تھی۔''

لونگی: نہیں جٹا وٹا تو نہ تھی نہ کپڑے ہی گیروے رنگ کے تھے۔ ہاں کمنڈل لیے ہوئے تھے۔ جتنے دنوں میں جگن ناتھ پوری میں رہی وہ ایک بار روز میرے پاس آ کر پوچھ جاتے۔ 'کیوں ماتا جی آپ کو کسی بات کی تکلیف تو نہیں' اور یاتریوں سے بھی وہ یہی سوال کرتے تھے۔

شنکھ دھر نے پوچھا۔ ''تم نے یہاں تار کیوں نہ دے دیا؟ ہم لوگ وہاں پہنچ جاتے۔''

لونگی: ارے تو کوئی بات بھی ہو بیٹا۔ بغیر جانے بوجھے کیا تار دیتی؟

شنکھ دھر: میں اگر انہیں ایک بار دیکھ لوں تو پھر کبھی ساتھ ہی نہ چھوڑوں کیوں دائی۔ تمہارے خیال میں سنیاسی جی کی عمر کیا رہی ہوگی؟

لونگی: میں تو سمجھتی ہوں ان کی عمر چالیس برس کی ہوگی۔

شنکھ دھر نے کچھ حساب کر کے کہا۔ ''یہی تو بابو جی کی بھی عمر ہوگی۔''

منورما نے مصنوعی غصہ سے کہا۔ ''ہاں ہاں۔ وہی تمہارے بابو جی ہوں گے۔ اب مانا ابھی ان کی عمر چالیس برس کیسے ہو جائے گی؟''

شنکھ دھر سمجھ گیا کہ منورما کو یہ ذکر برا لگتا ہے۔ اس کے متعلق پھر منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالا، لیکن وہاں رہنا اب اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ پوری کا حال تو اس نے کتابوں میں پڑھا تھا، لیکن اس کتابی واقفیت سے اسے اطمینان نہ ہوا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ پوری کو کون ریل جاتی ہے اور وہاں جا

کر لوگ ٹھہرتے کہاں ہیں۔ گھر کے کتب خانہ میں شاید ایسی کوئی کتاب مل جائے۔ یہ سوچ کر وہ باہر آیا اور شوفر سے بولا۔ ''مجھے گھر پہنچا دو۔''

گھر آ کر وہ کتب خانہ میں جا ہی رہا تھا کہ گرسیوک مل گئے۔ شنکھ دھر انہیں دیکھتے ہی بولا۔

''ماسٹر صاحب مہربانی کر کے مجھے کتب خانہ سے کوئی ایسی کتاب نکال دیجیے جس میں تیرتھ استھانوں کا پورا پورا حال ہو۔''

گرسیوک نے کہا۔ ''ایسی کوئی کتاب کتب خانہ میں نہیں ہے۔''

شنکھ دھر وہیں سے لوٹ پڑا اور موٹر تیار کرا کے شہر جا پہنچا۔ ابھی اس کا تیرہواں سال تھا، لیکن اس کے اطوار میں اتنا استحکام تھا کہ جو بات دل میں ٹھان لیتا اسے پورا کر کے ہی چھوڑتا۔ شہر جا کر اس نے انگریزی کتابوں کی کئی دکانوں میں کئی کتابیں خریدیں اور گھر چلا تو کتابوں کا ایک بنڈل اس کے ساتھ تھا۔

راجہ صاحب کھانا کھانے بیٹھے تو شنکھ دھر وہاں نہ تھا۔ اہلیا نے جا کر دیکھا تو وہ کمرے میں بیٹھا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ بولی۔ ''چل کر کھانا کھا لو دادا جی بلا رہے ہیں۔''

شنکھ دھر نے بھوک نہ ہونے کا بہانہ کیا۔ اہلیا سمجھ گئی کسی کتاب میں دل لگا ہوا ہے۔ آ کر اس کے سامنے کھلی ہوئی کتاب اٹھا لی اور دو چار سطریں پڑھ کر بولی۔ ''اس میں تو تیرتھوں کا حال لکھا ہوا ہے۔ یہ کتاب کہاں سے لائے؟''

شنکھ دھر نے کہا۔ ''آج ہی تو بازار سے لایا ہوں۔ دائی کہتی تھی کہ بابو جی کی صورت کا کوئی سنیاسی انہیں جگن ناتھ پوری میں ملا تھا۔''

لڑکے کی یہ فرزندانہ محبت دیکھ کر اہلیا کی آنکھیں آب گوں ہو گئیں۔ آہ میرے لال۔ تو نے تو باپ کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ تجھے اتنا بھی یاد نہیں کہ کب ان کی گود میں بیٹھا تھا۔ کب ان کے منہ سے پیار کی باتیں سنی تھیں۔ پھر بھی تجھے ان سے اتنی محبت ہے اور وہ اتنے سنگدل ہیں کہ سدھ ہی نہیں لیتے۔ آنسوؤں کی یورش کو روکتی ہوئی بولی۔ ''یہ کتاب

پھر دیکھنا۔ اس وقت چل کر کچھ کھالو۔ اٹھنے کو جی نہ چاہتا ہو تو یہیں لے آؤں۔"

شنکھ دھر: اچھا کھالوں گا۔ اماں کسی سے بھجوا دو۔ تم کیوں آؤ گی۔

اہلیا ایک لمحہ میں ایک چھوٹی سی تھالی میں اس کے لیے کھانا لے کر آئی اور شنکھ دھر کے سامنے بیٹھ گئی۔

شنکھ دھر کو بھوک تو تھی۔ پر آج جب اسے معلوم ہوا کہ چکر دھر سنیاسی ہو گئے ہیں تو یہ پر تکلف کھانا کیسے کھاتا۔ اب تک اسے یقینی طور پر ان کا حال معلوم نہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ کسی دوسری جگہ آرام سے ہوں گے۔ آج لونگی کی باتوں نے اس کے دل میں ایک تشویش پیدا کر دی۔ ایسی حالت میں یہاں کے عیش و آرام کا لطف اٹھانا وہ فرزندانہ سعادت کے خلاف سمجھنے لگا۔ اس لیے اس نے اہلیا سے کہا تھا کہ کھانا کسی کے ہاتھ بھجوا دینا۔ اب یہ تھالی دیکھ کر وہ مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔ اگر نہیں کھاتا تو اہلیا کو رنج ہو گا۔ کھاتا ہے تو لقمہ منہ میں نہیں جاتا۔ اسے خیال آیا۔ میں یہاں چاندی کے تھال میں انواع و اقسام کی نعمتیں کھانے بیٹھا ہوں اور بابو جی پر اس وقت نہ جانے کیا گزر رہی ہو گی۔ بے چارے کسی درخت کے نیچے پڑے ہوں گے۔ نہ جانے آج کچھ کھایا بھی یا نہیں۔ وہ تھالی پر بیٹھا، لیکن لقمہ اٹھاتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اہلیا اس کے دل کی کیفیت سمجھ گئی اور خود بھی رونے لگی۔ کون کسے سمجھاتا۔

آج سے اہلیا کو ہمیشہ یہی اندیشہ رہنے لگا۔ شنکھ دھر کہیں باپ کی تلاش میں بھاگ نہ جائے۔ گھر کے سب آدمیوں کو تاکید کر دی کہ شنکھ دھر کے سامنے اس کے باپ کا ذکر نہ کریں۔ کہیں شنکھ دھر کو باپ کے ترک وطن کا حقیقی سبب معلوم ہو جائے۔ نہیں تو پھر اسے کون روکے گا۔

اب اسے ہر دم یہی پچھتاوا ہوتا ہے کہ وہ شنکھ دھر کو لے کر کیوں نہ شوہر کے ساتھ چلی گئی۔ ثروت کی ہوس میں شوہر پہلے ہی کھو بیٹھی۔ کہیں بیٹے کو بھی نہ کھو بیٹھے۔

شنکھ دھر کا نام اسکول میں لکھا دیا گیا ہے۔ اسکول سے چھٹی پا کر وہ سیدھے لونگی کے

پاس جاتا ہے اور اس سے تیرتھ یاترا کی باتیں پوچھتا ہے۔ یاتری کیا کھاتے ہیں۔ کہاں ٹھہرتے ہیں۔ جہاں ریلیں نہیں ہیں وہاں لوگ کیسے جاتے ہیں۔ راستے میں چور تو نہیں ملتے؟ لونگی اس کے دل کی حالت سمجھتی ہے، لیکن خواہش نہ ہونے پر بھی اسے ساری باتیں بتاتی ہے۔ وہ جھنجھلاتی ہے۔ گھڑک بیٹھتی ہے، لیکن جب وہ بھولا بھالا لڑکا زبردستی اس کی گود میں بیٹھ جاتا ہے تو اسے رحم آ جاتا ہے۔

چھٹیوں میں شنکھ دھر اپنے باپ کے گھر کا درشن کرنے ضرور جاتا ہے۔ وہ گھر اس کے لیے تیرتھ ہے۔ نرملا کی آنکھیں اس کے دیدار سے سیر ہو نہیں ہوتیں۔ دادا اور دادی دونوں اس کی طفلانہ سرگرمی سے بھری باتیں سن کر مست ہو جاتے ہیں۔ انہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چکر دھر ہی اس شکل میں ان کا غم غلط کرنے آتا ہے۔

ایک دن نرملا نے کہا۔ ''بیٹا تم یہیں آ کے کیوں نہیں رہتے۔ تم چلے جاتے ہو تو یہ گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔''

شنکھ دھر نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''اماں تو آتی ہی نہیں۔ وہ یہاں کیوں نہیں آتیں دادی جی؟''

نرملا: اب یہ تو وہی جانیں۔ تم کبھی پوچھتے نہیں؟ آج پوچھنا۔ دیکھو کیا کہتی ہیں۔

شنکھ دھر: نہیں دادی وہ رونے لگیں۔ جب تھوڑے دنوں میں میں گدی پر بیٹھوں گا تو یہی گھر میرا شاہی محل ہوگا۔ تبھی اماں جی آئیں گی۔

جب وہ چلنے لگا تو نرملا دروازے تک اس کے پیچھے آئی۔

یکا یک شنکھ دھر ڈیوڑھی میں کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''دادی جی آپ سے کچھ مانگنا چاہتا ہوں۔''

نرملا نے پوچھا۔ ''کیا مانگنا چاہتے ہو؟''

شنکھ دھر نے کہا۔ ''آپ مجھے دعا دیجیے کہ میری دلی مراد بر آئے۔''

نرملا نے اسے گلے لگا کر کہا۔ ''بھیا میرا تو رواں رواں تمہیں دعا دیا کرتا ہے۔ ایشور

تمہاری ساری مرادیں پوری کرے۔''

شنکھ دھر گھر پہنچا تو اہلیا نے پوچھا۔ ''آج اتنی دیر کہاں لگائی بیٹا۔ میں کب سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں۔''

شنکھ دھر: ابھی تو ایسی دیر نہیں ہوئی اماں۔ ذرا دادی کے پاس چلا گیا تھا۔ انہوں نے آج مجھے ایک پیغام کہلا بھیجا ہے۔

اہلیا: کیا پیغام ہے سنوں؟ کچھ تمہارے بارے بابو جی کی خبر تو نہیں ملی؟

شنکھ دھر: نہیں بابو جی کی خبر تو نہیں ملی مگر تم کبھی کبھی وہاں کیوں نہیں چلی جاتیں؟

اہلیا نے اوپری من سے ہاں تو کہہ دیا، لیکن اس کے انداز سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہاں جانا وہ مناسب نہیں سمجھتی۔ شاید وہ کہہ سکتی تو کہتی۔ وہاں سے ایک بار نکال دی گئی۔ اب کون سا منہ لے کر جاؤں۔ کیا اب میں کوئی دوسری ہو گئی ہوں۔

اہلیا طشتریوں میں میوے اور مٹھائی لائی اور بولی۔ ''وہاں تو کچھ کھایا نہ ہوگا۔ آج اتنے اداس کیوں ہو؟''

شنکھ دھر نے طشتریوں کی طرف بغیر دیکھے کہا۔ ''اس وقت تو کھانے کو جی نہیں چاہتا۔''

ایک لمحہ بعد اس نے کہا۔ ''کیوں اماں، بابو جی کو ہم لوگوں کی یاد بھی کبھی آتی ہوگی؟''

اہلیا نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ''کیا جانیں بیٹا، یاد آتی تو کالے کوسوں کیوں بیٹھے رہتے؟''

اہلیا رو رہی تھی۔ کچھ بول نہ سکی۔ اس کی آواز آنسوؤں کے سیلاب میں ڈوبی جا رہی تھی۔

شنکھ دھر نے پھر کہا۔ ''مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے نرموہی ہیں۔ اسی سے تو انہیں ہم لوگوں کی یاد نہیں آتی۔ میرا تو کبھی کبھی ایسا جی چاہتا ہے کہ صاف صاف کہہ دوں۔ آپ میرے ہوتے کون ہیں۔ آپ ہی نے تو ہم لوگوں کو بھلا دیا۔ اگر انہیں دیکھوں تو

پرنام تک نہ کروں۔''

اب اہلیا چپ نہ رہ سکی۔ رقت آمیز لہجہ میں بولی۔ ''انہوں نے ہمیں بھلا نہیں دیا ہے۔ وہاں ان کی جو حالت ہوگی وہ میں جانتی ہوں۔''

شنکھ دھر نے کچھ شرماتے ہوئے کہا۔ ''کیوں اماں مجھے دیکھیں تو پہچان جائیں گے یا نہیں؟''

اہلیا: میں تو سمجھتی ہوں نہ پہچان سکیں گے۔ تب تم بہت ذرا سے تھے۔ آج ان کو گئے دسواں سال ہے۔ میں تو تمہیں دیکھ کر جیتی ہوں۔ وہ کس کو دیکھ کر دل کو تسکین دیتے ہوں گے۔''

شنکھ دھر اپنی ہی دھن میں مست تھا۔ بولا۔ ''لیکن میں تو انہیں فوراً پہچان لوں گا۔ دیکھ کر چاہے کسی بھیس میں ہوں۔''

اہلیا: نہیں بھیا تم بھی انہیں نہ پہچان سکو گے۔ تم نے ان کی تصویریں ہی تو دیکھی ہیں۔ وہ تصویریں بارہ سال پہلے کی ہیں۔

شنکھ دھر نے کچھ جواب نہ دیا اور باغیچہ میں جا کر پھول توڑنے لگا۔ پھر اپنے کمرہ میں آیا اور چپ چاپ بیٹھ کر سوچنے لگا۔ وہ یہاں سے نکل بھاگنے کے لیے بے قرار تھا۔

یکا یک اسے خیال آیا۔ ایسا نہ ہو یہ لوگ میری تلاش میں نکلیں۔ تھانے میں حلیہ لکھائیں۔ خود بھی پریشان ہوں اور مجھے بھی پریشان کریں۔ اس لیے انہیں اتنا بتلا دیں کہ میں کہاں کس کام سے جا رہا ہوں۔ اگر کسی نے مجھے زبردستی لانا چاہا تو اچھا نہ ہوگا۔ ہماری خوشی ہے جب چاہیں گے آئیں گے۔ ہمارا راج تو کوئی اٹھا لے نہ جائے گا۔ اس نے کاغذ پر ایک خط لکھا اور اپنے بستر پر رکھ دیا۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ شنکھ دھر ایک کرتہ پہنے گھر سے نکلا۔ بغل کے کمرے میں راجہ صاحب آرام کر رہے تھے۔ وہ عقب کی طرف باغ میں آ گیا اور امرود کے درخت پر چڑھ کر باہر کود پڑا۔ اب اس کے سر پر تاروں سے جگمگاتا آسمان تھا۔ سامنے وسیع میدان اور سینے میں امید، خوف اور آرزوؤں سے تڑپتا

دل۔وہ تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا چلا۔کچھ نہیں معلوم کدھر جا رہا ہے۔تقدیر کہاں لیے جا رہی ہے۔

بائیس

پانچ سال گزر گئے۔مگر نہ کہیں شنکھ دھر کا پتہ چلا نہ چکر دھر کا۔راجہ بشال سنگھ نے رحم اور انصاف کو خیر باد کہہ دیا ہے اور خوب دل کھول کر ظلم کر رہے ہیں۔رحم اور انصاف سے جو کچھ ہوتا ہے اس کا تجربہ حاصل کر لینے کے بعد وہ اب یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ سختی اور ظلم سے کیا ہوتا ہے۔ریاست میں ثواب کے جتنے کام ہوتے تھے وہ سب بند کر دیئے گئے ہیں۔مندروں میں چراغ نہیں جلتے۔سادھو سنت دروازے سے کھڑے کھڑے نکال دیئے جاتے ہیں۔غریب رعایا کی فریاد کوئی نہیں سنتا۔راجہ صاحب کو کسی پر رحم نہیں آتا۔ اب کیا رہ گیا ہے جس کے لیے وہ نیکی کریں اور حق کا دامن پکڑیں۔وہ لاڈلا اب کہاں ہے جس کے ایثار سے ہی آنکھوں کو سرور ہوتا تھا۔وہ زندگی اور موت کی سبھی آرزوؤں کا مرکز کہاں چلا گیا۔اگر ایشور نے ان کے اوپر یہ ستم ڈھائے ہیں تو وہ بھی اس کے نقش قدم پر چلیں گے۔اتنے آدمیوں میں صرف منورما ہے جس نے ابھی تک صبر اور توکل کا دامن نہیں چھوڑا،لیکن اب اس کی کوئی نہیں سنتا۔راجہ صاحب اب اس کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتے۔وہ اسی کو ساری مصیبتوں کا باعث سمجھتے ہیں۔وہی منورما جو ان کے دل کی رانی تھی۔جس کے اشارے پر ریاست چلتی تھی۔اب کسمپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی ہے۔

شام ہوگئی ہے۔روشنی کا دیوتا پہاڑوں کے دامن میں چھپ گیا ہے۔عورتیں پنگھٹ پر پانی بھرنے جمع ہوگئی ہیں۔اسی وقت ایک نوجوان ہاتھ میں کھنجری لیے آ کر کنویں کی جگت پر بیٹھ گیا۔یہی شنکھ دھر ہے۔اگر اب اہلیا بھی اسے دیکھے تو شاید پہچان نہ سکے۔ اس کے رنگ و روپ میں اتنا تغیر ہوگیا ہے کہ اب وہ صرف اپنے پچھلے رنگ و روپ کی پرچھائیں نظر آتا ہے۔اس کا گوشت سوکھ گیا ہے۔اب صرف ہڈیوں کا پنجر رہ گیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کسی خوفناک بیماری نے اسے گھیر لیا ہے۔

ایک حسینہ نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''کہاں سے آئے ہو۔ پردیسی ہو۔ بیمار معلوم ہوتے ہو۔''

شنکھ دھر نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''بیمار تو نہیں ہوں۔ دور سے آتے آتے تھک گیا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی کھنجڑی اٹھائی اور گانے لگا۔

اس خستہ حال نوجوان کے گلے میں اتنا لوچ تھا۔ اس کی آواز میں اتنی دل کشی اور لہجہ اتنا مستی میں ڈوبا ہوا کہ وہ نازنین محویت کے عالم میں کھڑی رہ گئیں۔

ایک حسینہ نے پوچھا۔ ''بابا جی اب تو بہت دیر ہوگئی۔ یہیں ٹھہر جاؤ۔ آگے تو بہت دور تک کوئی گاؤں نہیں ہے۔''

شنکھ دھر: آپ کی مرضی ہے ماتا جی تو یہیں ٹھہر جاتے ہیں۔ یہاں کوئی مہاتما تو نہیں رہتے؟

دوسری عورت نے کہا۔ ''ابھی کئی دن ہوئے ایک مہاتما آ کر ٹکے تھے۔ پر وہ سادھوؤں کے بھیس میں نہیں تھے۔ وہ یہاں ایک مہینہ رہے۔ تم اگر ایک دن پہلے آ جاتے تو ان کے درشن ہو جاتے۔''

ایک بڑھیا نے کہا۔ ''سادھو سنت تو بہت دیکھے مگر ایسا اپکاری آدمی نہیں دیکھا۔ تمہارا گھر کہاں ہے بیٹا؟''

''کہاں بتاؤں ماتا۔ یوں ہی گھومتا پھرتا ہوں۔''

بڑھیا: تمہارے ماں باپ تو ہوں گے؟

شنکھ دھر: کچھ معلوم نہیں۔ پانچ سال ہوئے۔ باپ کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا۔ تب سے ان کا حال بھی نہیں معلوم۔

بڑھیا: تمہارے باپ کیوں چلے گئے۔

شنکھ دھر: دنیا کے جھگڑوں میں نہیں پھنسنا چاہتے تھے اور کیا۔ پانچ سال سے تلاش کر

رہا ہوں، پر کہیں پتہ نہیں چلا۔

ایک لڑکی نے بڑھیا سے کہا۔ ''اماں ان کی صورت ان مہاتما سے ملتی ہے کہ نہیں۔ کچھ معلوم ہوتا ہے۔''

بڑھیا: ہاں کچھ کچھ معلوم تو ہوتا ہے۔ کیوں بیٹا تمہارے باپ کی عمر کیا ہوگی۔

شنکھ دھر: یہی کوئی چالیس سال کی ہوگی۔

بڑھیا: آنکھیں خوب بڑی بڑی ہیں؟

شنکھ دھر: ہاں ماتا جی اتنی بڑی آنکھیں تو میں نے کسی کی دیکھی ہی نہیں۔

بڑھیا: لمبے لمبے گورے آدمی ہیں؟

شنکھ دھر کا سینہ دھک دھک کرنے لگا بولا۔ ''ہاں ماتا جی بھگت ایسے ہی ہیں۔''

بڑھیا: بیٹا جن مہاتما کا ذکر میں نے تم سے کیا ہے۔ ان کی صورت تم سے بہت ملتی ہے۔

شنکھ دھر: ماتا جی کچھ بتا سکتی ہیں وہ یہاں سے کدھر گئے؟

بڑھیا: یہ تو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ پر وہ اتر کی طرف گئے ہیں۔

شنکھ دھر نے کانپتے ہوئے لہجہ میں پوچھا۔ ''ان کا نام کیا تھا ماتا جی؟''

''نام تو ان کا بھگوان داس تھا۔ پر یہ ان کا اصلی نام نہیں معلوم کچھ اور تھا۔''

ایک لڑکی نے کہا۔ ''یہاں ان کی ایک تصویر بھی تو رکھی ہوئی ہے۔''

شنکھ دھر نے بے تاب ہو کر کہا۔ ''ذرا وہ تصویر مجھے دکھا دیجیے۔ آپ کا بڑا احسان ہو گا۔''

حسینہ لپکی ہوئی گھر گئی اور ایک لمحہ میں تصویر لے کر لوٹ آئی۔ شنکھ دھر نے دونوں ہاتھوں سے دل کو سنبھالے ہوئے تصویر پر ایک سہمی ہوئی نگاہ ڈالی اور فوراً پہچان گیا۔ ہاں یہ چکر دھر ہی کی تصویر تھی۔ شنکھ دھر کے اعضاء جیسے شل ہو گئے۔ دل کی حرکت جیسے بند ہو گئی۔ امید، بیم، فکر اور پریشانی سے مغلوب ہو کر وہ سکتہ کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔

دفعتاً اس نے نیند سے جاگے ہوئے آدمی کی طرح پوچھا۔ آپ نے کہا وہ اتر کی طرف گئے ہیں۔ کوئی گاؤں پڑے گا؟''

بڑھیا: ہاں بیٹا۔ پانچ کوس پر ایک گاؤں ہے سائیں گنج، لیکن آج تو تم یہیں ٹھہرو گئے۔

شنکھ دھر نے صرف اتنا کہا۔ ''نہیں ماتا جی اب اجازت دیجیے۔'' اور کھنجڑی اٹھا کر چل کھڑا ہوا۔

رات کی اس عمیق اور شدید تاریکی میں شنکھ دھر بھاگا چلا جا رہا تھا۔ پاؤں پتھر کے ٹکڑوں سے چھلنی ہو گئے تھے۔ سارا جسم ماندگی کے غلبہ سے چور چور ہو گیا تھا۔ بھوک کے مارے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا جاتا تھا اور پیاس کی شدت سے حلق میں کانٹے پڑے ہوئے تھے۔ پیر کہیں رکھتا تھا اور کہیں پڑتے تھے۔ پر گرتا پڑتا بھاگتا چلا جاتا تھا۔ اگر وہ طلوع سحر تک سائیں گنج نہ پہنچا تو ممکن ہے چکر دھر کہیں اور چلے جائیں اور اس بے کس کی پانچ سال کی پریشانی دوڑ دھوپ خاک میں مل جائے گی۔

خونخوار درندوں کی مہیب صدائیں کان میں آتی تھیں اور اس کا خون سرد ہو جاتا تھا۔ اندھیرے میں کھڈ اور ٹیلے کی تمیز نہ ہوتی تھی۔ پر وہ جان ہتھیلی پر لیے ہوئے تھا۔ اسے صرف یہ دھن تھی کہ سورج دیوتا کے درشن سائیں گنج میں ہوں۔

افق مشرق میں سرخی چھا گئی۔ تارے کسی تھکے ماندے مسافر کی طرح آنکھیں بند کر کے آرام کرنے لگے۔ چڑیاں شاخوں پر چہکنے لگیں۔ پر سائیں گنج کا کہیں پتہ نہ تھا۔

دفعتاً ایک بہت دور کی پہاڑی پر چند چھوٹے چھوٹے مکانات لڑکیوں کے گھروندوں کی طرح نظر آئے۔ وہ سائین گنج آ گیا۔ شنکھ دھر کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ اس کے نیم جان جسم میں غیر معمولی چستی پیدا ہو گئی۔ اس نے اور تیزی سے قدم اٹھائے اور آگے بڑھا۔ پہاڑی کی چڑھائی دشوار تھی۔ نہ کوئی آدمی نظر آتا تھا کہ اس سے راستہ پوچھے۔ مگر وہ کمر باندھے اوپر چلا جا رہا تھا۔ ایک آدمی نے اوپر سے آواز دی۔ ''ادھر سے

کہاں آتے ہو بھائی؟ راستہ پچھم کی طرف ہے۔ کہیں پاؤں پھسل جائے تو دو سو ہاتھ نیچے جاؤ۔''

لیکن شنکھ دھر کو ان باتوں کے سننے کی فرصت کہاں تھی۔ دم کے دم میں اوپر پہنچ گیا اور پوچھا۔ ''بابا بھگوان داس ابھی یہاں ہیں نا؟''

کسان: کون بابا بھگوان داس۔ یہاں تو کبھی نہیں آئے۔ کہاں سے آئے ہو؟

شنکھ دھر: بابا بھگوان داس کو نہیں جانتے۔ وہ اسی گاؤں میں تو آئے ہیں۔ سائیں گنج یہی ہے نا؟

کسان: سائیں گنج ارے رے سائیں گنج تو تم پورب چھوڑ آئے ہو۔ اس گاؤں کا نام بیندر ہے۔

شنکھ دھر نے مایوس ہو کر کہا۔ ''سائین گنج یہاں سے کتنی دور ہے۔''

کسان: سائیں گنج پڑے گا یہاں سے پانچ کوس۔ مگر راستہ بیہڑ ہے۔

شنکھ دھر کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پانچ کوس کی منزل اس پر راستہ بیہڑ۔ اس نے آسمان کی طرف ایکبار حسرت سے دیکھا اور سر جھکا کر سوچنے لگا۔ اگر اس موقع پر ان کے درشن نہ ہوئے تو پھر شاید کبھی نہ ہوں۔ ساری زندگی تلاش ہی میں گزر جائے گی۔ دم لینے کا موقع نہیں۔ آج یا تو اس تپسیا کا خاتمہ ہو جائے گا یا اس زندگی کا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

کسان نے پوچھا۔ ''کیا چل دیئے بھائی۔ چلم ولم تو پی لو۔'' لیکن شنکھ دھر اس سے پہلے ہی چل چکا تھا۔ وہ کچھ نہیں دیکھتا کچھ نہیں سنتا۔ چپ چاپ کسی اندھی طاقت کی طرح خاموش چلا جا رہا ہے۔ شنکھ دھر سوچ رہا ہے اب کے پھر کہیں راستہ بھولا تو کہیں کا نہ رہوں گا۔ جو بھی راستہ میں ملتا اس سے سائیں گنج کا راستہ پوچھ لیتا۔ وہ سوچ رہا تھا کیا ان کے درشن ہو گے۔ وہ ان کے سامنے جا بھی سکے گا یا نہیں۔ وہ اسے دیکھ کر ناراض تو نہ ہوں گے۔ وہ اسے گھر واپس جانے کی ترغیب دیں گے۔ شاید گھر والوں کی انہیں یاد بھی نہ ہو۔ انہی خیالات میں ڈوبا ہوا شنکھ دھر دھاوا مارے چلا جا رہا ہے۔ آخر دوپہر ہوتے

ہوتے اسے دور سے ایک مندر کا کلس نظر آیا۔ ایک چرواہے سے پوچھا۔ ''کون گاؤں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''سائیں گنج۔'' سائیں گنج آ گیا۔ وہ مقام جہاں اس کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔

لیکن جوں جوں گاؤں قریب آتا تھا شنکھ دھر کے پاؤں سست پڑتے جاتے تھے۔ اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں وہ یہاں سے بھی نہ چلے گئے ہوں۔ وہ اس خیال کو کتنا ہی دل سے نکالنا چاہتا تھا۔ پر وہ آسن نہ چھوڑتا تھا۔

سائیں گنج سامنے دکھائی دینے لگا۔ کھیتوں میں مرد و زن اناج کاٹتے نظر آنے لگے۔ اب وہ گاؤں کے ڈانوں پر پہنچ گیا۔ کئی آدمی اس کے سامنے سے ہو کر گزرے پر اس نے کسی سے پوچھا نہیں۔ اگر کسی نے کہہ دیا، باباجی نہیں ہیں تو کیا کرے گا۔ اگر کہہ دیا بابا جی ہیں تب بھی وہ کیا کرے گا۔ اس حیص بیص میں پڑا ہوا وہ مندر کے سامنے کے چبوترے پر بیٹھ گیا۔

یکا یک ایک آدمی کو مندر سے نکلتے دیکھ کر چونک پڑا۔ پھر اٹھا کہ اس کے پیروں پر گر پڑے مگر پیر تھرا گئے۔ معلوم ہوا کوئی ندی اس طرف بہتی چلی آتی ہے۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

شنکھ دھر کو ہوش آیا تو اس نے اپنے کو مندر کے برآمدے میں چکر دھر کی گود میں پڑا پایا۔ چکر دھر تشویشناک نگاہوں سے اس کے چہرہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ گاؤں کے کئی آدمی آس پاس کھڑے پنکھا جھل رہے تھے۔ آہ آج کتنے دنوں کے بعد شنکھ دھر کو یہ نعمت ملی ہے۔ وہ باپ کی گود میں لیٹا ہوا ہے۔ شنکھ دھر نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

چکر دھر نے پیار کی مٹھاس میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیوں بیٹا اب کیسی طبیعت ہے؟''

کتنے مدھر الفاظ تھے۔ کسی کے کانوں نے ایسی میٹھی زبان نہ سنی ہو گی۔ اس نے خاموش رہنا ہی مصلحت سمجھی۔ کچھ جواب دینا بھی چاہتا تو اس کے منہ سے الفاظ نہ نکلتے۔

اس کا جی چاہتا تھا، ان کے قدموں پر سر رکھ کر خوب روئے اس سے بڑی مسرت کا وہ قیاس ہی نہ کر سکتا تھا۔

چکر دھر نے پھر پوچھا۔ ''کیوں بیٹا کیسی طبیعت ہے؟''

شنکھ دھر نے دبی آواز میں کہا۔ ''اب تو اچھا ہوں۔ آپ ہی کا نام بابا بھگواس داس ہے؟''

''ہاں مجھ کو ہی بھگوان داس کہتے ہیں۔''

شنکھ دھر: میں آپ ہی کے درشنوں کے لیے آیا ہوں۔ آپ کے درشن ہو گئے۔ میری مراد پوری ہو گئی۔ ساری مصیبتیں کٹ جائیں گی۔

چکر دھر کو اپنی طاقت پر قابو نہ رہا۔ اس نوجوان کے بشرے اور انداز گفتگو میں نہ جانے ایسی کون سی بات تھی جو انہیں اپنی جانب مائل کر رہی تھی۔ ان کے دل میں اس کی داستان سننے کا بے تاب کن اشتیاق پیدا ہوا۔

ایک آدمی پانی لایا۔ شنکھ دھر نے منہ ہاتھ دھویا اور لوٹے کو منہ سے لگا کر پانی پینا چاہتا تھا کہ چکر دھر بول اٹھے۔ ''ہاں ہاں یہ کیا۔ ابھی پانی نہ پیو۔ رات کو کچھ کھایا نہیں اور خالی پیٹ پانی پینے لگے۔''

شنکھ دھر: بڑی پیاس لگی ہے۔

چکر دھر: پانی کہیں بھاگا نہیں جاتا۔ کچھ کھا کر پیو۔

شنکھ دھر: دو ہی گھونٹ پی لوں، نہیں رہا جاتا۔

چکر دھر نے اس کے ہاتھ سے لوٹا چھین لیا اور سخت ہو کر بولے۔ ''ابھی ایک قطرہ پانی نہیں پی سکتے۔ منع کرتا ہوں تو مانتے نہیں۔''

شنکھ دھر کو اس تنبیہ میں جو مزہ آیا وہ ماں کے لاڈ پیار کی باتوں میں بھی نہ آیا۔

مندر کے پیچھے ایک چھوٹا سا باغ اور کنواں تھا۔ وہیں ایک درخت کے نیچے چکر دھر کا کھانا پکتا تھا۔ چکر دھر اپنا کھانا خود پکاتے تھے۔ برتن بھی آپ ہی دھوتے تھے۔ شنکھ دھر

ان کے ساتھ کھانا کھانے گیا تو دیکھا تھالی میں پوری، مٹھائی، دودھ، دہی، گھی سب کچھ ہے۔ اس کی رال ٹپکنے لگی۔ ان نعمتوں کا مزہ چکھے ہوئے اسے ایک مدت گزر گئی۔ مگرا سے کتنی حیرت ہوئی جب اس نے دیکھا کہ یہ ساری چیزیں اسی کے لیے مخصوص ہیں۔ چکر دھر خود روکھی روٹیاں اور بھاجی لے کر بیٹھے۔

شنکھ دھر نے کہا۔ ''آپ تو سب کچھ مجھ کو ہی دیئے دیتے ہیں۔ اپنے لیے کچھ رکھا ہی نہیں۔''

چکر دھر: بیٹا میں تو روٹیوں کے سوا کچھ نہیں کھاتا۔ میرا ہاضمہ کمزور ہے۔ دن میں صرف ایک بار کھاتا ہوں۔

شنکھ دھر: میری خوراک تو تھوڑا سا ستو اور چنا ہے۔ میں نے تو مدت سے یہ نعمتیں نہیں کھائیں۔ اگر آپ نے کھائیں گے تو میں بھی نہ کھاؤں گا۔

آ کر شنکھ دھر کے اصرار سے چکر دھر کو اپنا اصول توڑنا پڑا، سولہ برسوں سے پالا ہوا اصول۔ انہوں نے جھنجھلا کر کہا۔ ''تم تو بڑے ضدی معلوم ہوتے ہو اچھا لو میں بھی لیے لیتا ہوں۔''

انہوں نے تھالی کی ہر ایک چیز میں سے ذرا ذرا سا نکال کر اپنے پتل میں رکھ لیا۔

شنکھ دھر: آپ نے تو محض رسم کی پابندی کی ہے۔ لائیے میں پروس دوں۔

چکر دھر: اگر تم اسی طرح ضد کرو گے تو میں تمہیں اپنے ساتھ نہ رکھوں گا۔

شنکھ دھر: مجھے کیا۔ یہیں پڑے پڑے مر جاؤں گا۔ کون کوئی رونے والا بیٹھا ہوا ہے۔

یہ کہتے کہتے شنکھ دھر کی آنکھیں پر آب ہو گئیں۔ چکر دھر نے مجبور ہو کر کہا۔ ''اچھا لاؤ تمہی اپنے ہاتھ سے دے دو بھائی۔ اپنے کو کوستے کیوں ہو۔''

شنکھ دھر نے سبھی چیزوں سے آدھی سے زیادہ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیں اور آپ ایک پنکھا لے کر انہیں جھلنے لگا۔ چکر دھر نے ملائمیت آمیز ترشی سے کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے آج تم مجھے بیمار کرو گے۔ بھلا اتنی چیزیں میں کھا سکوں گا؟''

شنکھ دھر: اسی لیے تو میں نے تھوڑی تھوڑی دی ہیں۔

چکر دھر: یہ تھوڑی تھوڑی ہیں تو کیا تم سب کی سب میرے پیٹ میں ٹھونس دینا چاہتے ہو؟ اب بیٹھو گے یا نہیں؟ مجھے پنکھے کی ضرورت نہیں ہے۔

شنکھ دھر: آپ کھائیے۔ جو کچھ آپ چھوڑیں گے وہ میں کھالوں گا۔

اس کی آنکھیں پر آب ہو گئیں۔ چکر دھر نے شکوہ آمیز لہجہ میں کہا۔ ''میرا جوٹھا کیوں کھاؤ گے اب تو ساری باتیں تمہاری مرضی کے مطابق ہو رہی ہیں۔''

شنکھ دھر: مجھے بہت دنوں سے یہ آرزو ہے۔ ایک مدت سے یہ موقع ڈھونڈ رہا تھا۔

چکر دھر کو پھر ہار ماننی پڑی۔ وہ گوشۂ عافیت میں رہنے والا نفس کش، زہد پرور، عامل آج ایک اجنبی بے کس لڑکے کے احمقانہ اصرار کو کسی طرح نہ ٹال سکتا تھا۔

چکر دھر جب کھانا کھا کر اٹھ گئے تو وہ کھانے بیٹھا۔ آہ آج اس کھانے میں کتنی لذت تھی۔ گھر پر تکلف سے پکے ہوئے پکوانوں میں بھی لذت نہ تھی۔

چکر دھر ہاتھ منہ دھو کر رقت آمیز لہجہ میں بولے۔ ''تم نے آج میرے دو اصول توڑ دیئے۔ بغیر جانے بوجھے کسی کو مہمان بنانے کا یہی نتیجہ ہے۔ اب میں کہیں نہ جاؤں گا۔ تم کھانا کھالو۔ اور مجھ سے جو کچھ کہنا ہو کہو۔ میں ایسے ضدی لڑکے کو اپنے ساتھ نہ رکھوں گا۔ تمہارا گھر کہاں ہے؟''

شنکھ دھر: میرا تو کوئی گھر ہی نہیں۔

چکر دھر: ماں باپ تو ہوں گے۔ وہ کس گاؤں میں رہتے ہیں؟

شنکھ دھر: یہ مجھے معلوم نہیں۔ میرے والد تو بچپن ہی میں گھر سے نکل گئے اور والدہ کی پانچ سال سے مجھے خبر نہیں۔

چکر دھر کو ایسا معلوم ہوا گویا زمین نیچے دھنسی جا رہی ہے۔ گویا وہ لہروں میں بہے جا رہے ہیں۔ بابا بچپن میں گھر سے چلے گئے اور ماں کی پانچ سال سے کچھ خبر نہیں ملی۔ بھگوان کیا یہ وہی ننھا سا لڑکا ہے۔ وہی جسے دل سے نکال ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے

سولہ سال سے زیادہ ہو گئے۔

انہوں نے دل کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''تم پانچ سال تک کہاں رہے جو گھر نہیں گئے؟ ''

شنکھ دھر: بابا کی تلاش میں نکلا تھا اور جب تک وہ نہ ملیں گے لوٹ کر نہ جاؤں گا۔

چکر دھر کا سینہ دھک دھک کرنے لگا۔ وہ سائبان کے ستون کا سہارا لے کر بیٹھ گئے اور کانپتی آواز میں بولے۔

''تمہارا نام کیا ہے۔ بیٹا؟''

یہ سوال نہ تھا ایک معلوم حقیقت کی تصدیق تھی۔ اس سوال کا جواب وہی ہو گا جس کا امکان چکر دھر کو امید و بیم کی حالت میں ڈالے ہوئے تھا۔ دنیا میں ایک ایسا ہی لڑکا ہے جسے اس کا باپ بچپن میں چھوڑ کر چلا گیا ہو۔

شنکھ دھر نے اپنا نام بتا دیا۔

''تمہارے باپ کا نام کیا ہے؟''

شنکھ دھر نے باپ کا نام بھی بتا دیا۔

''مکان کہاں ہے؟''

''جگدیش پور۔''

چکر دھر کو ایسا معلوم ہوا کہ ان کے بدن سے جان نکل گئی ہو اور چاروں طرف خلا ہے۔ شنکھ دھر، بس یہی ایک لفظ اس فضائے بیکراں میں کسی چڑے کی طرح چکر لگا رہے ہوں۔ شنکھ دھر ایک ڈور تھی جو اس بے ہوشی کی حالت میں بھی استدراک کو تعلقات سے باندھے ہوئے تھی۔

شنکھ دھر کو اپنے باپ کے ساتھ رہتے ایک مہینہ ہو گیا۔ نہ وہ جانے کا نام لیتا ہے نہ چکر دھر جانے کو کہتے ہیں۔ شنکھ دھر اتنا خوش و خرم رہتا ہے گویا اسے کسی چیز کی آرزو نہیں۔ اب اس کے مردانہ چہرے پر سرخی نظر آنے لگی ہے اور جسم بھر آیا ہے۔

چکر دھر کو اب اپنے ہاتھوں کوئی کام نہیں کرنا پڑتا۔ وہ جب ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں جاتے ہیں تو ان کا سامان شنکھ دھر اٹھا لیتا ہے۔ دونوں آدمیوں کی زندگی کا سب سے مسرت بخش موقع وہ ہوتا ہے جب ایک سوال کرتا ہے دوسرا جواب دیتا ہے۔ بابا جی اپنی زندگی کے تجربات، سائنس، مذہب، تاریخ اور دیگر علوم کی ساری باتیں گھول کر پلا دینا چاہتے تھے۔ دوسروں سے اس کی شرافت اور تحمل کی تعریف سن کر ان میں کتنی مسرت ہوتی ہے، یہ حقیقت اب کسی سے پوشیدہ نہیں کہ شنکھ دھر ان کا لڑکا ہے۔ صورت کی مشابہت اس خیال کی تصدیق کرتی ہے۔ جو بات سب جانتے ہیں اسے وہ خود نہیں جانتے اور نہ جاننا چاہتے ہیں۔

شنکھ دھر کو کبھی کبھی صبر آزما خواہش ہوتی تو یہ کہ پتا جی کے قدموں پر گر پڑوں اور ساری کیفیت صاف صاف بیان کر دوں مگر یہ خواہش اسی تک محدود نہ تھی۔ چکر دھر بھی کبھی کبھی بیٹے کی محبت سے بےتاب ہو جاتے اور چاہتے کہ اسے گلے لگا کر کہوں کہ بیٹا! تم میری آنکھوں کے تارے ہو۔ وہ شنکھ دھر کے منہ سے دادی کی اشک ریزی اور زمجہ کے عیش و غضب کی داستان سننے سے کبھی نہ تھکتے تھے۔ رانی منورما کو ان کا کتنا خیال تھا۔ یہ چرچا سن کر چکر دھر بہت رنجیدہ ہو جاتے تھے۔

اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا اور شنکھ دھر کو فکر ہوئی کہ انہیں کسی بہانے سے گھر لے چلو، لیکن بہت غور کرنے پر بھی کوئی تدبیر نہ سوجھی۔ تب اس نے فیصلہ کیا کہ ماں کو خط لکھ کر کیوں نہ یہیں بلا لوں۔ وہ خط پاتے ہی سر کے بل دوڑی آئیں گی۔ وہ پچھتایا کہ میں ناحق اتنے دنوں تک شش و پنج میں پڑا رہا۔ اس رات کو اس نے اپنی ماں کے نام خط ڈال دیا۔ خط کے آخر میں پورا پتہ ریل کے اسٹیشن وغیرہ کی تفصیل لکھ دی۔

ایک مہینہ گزر گیا اور نہ اہلیا آئی نہ کوئی دوسرا ہی۔ شنکھ دھر دن بھر اس کی راہ دیکھتا رہتا۔ ریل کا اسٹیشن وہاں سے پانچ میل تھا۔ راستہ بھی صاف تھا۔ پھر بھی کوئی نہیں آیا۔ چکر دھر جب کہیں جاتے تو وہ چپکے سے اسٹیشن کی راہ لیتا اور مایوس لوٹ آیا۔ آخر اسے

ایک دن خط ملا۔ جسے پڑھ کر اسے بے حد افسوس ہوا۔ اہلیا نے لکھا تھا۔ ''میں بڑی بدنصیب ہوں۔تم نے اتنی جانکاہی کے بعد جس دیوتا کے درشن کیے اس کے درشن کی بہت خواہش ہونے پر بھی یہاں سے ہل نہیں سکتی۔ایک مہینہ سے بیمار ہوں۔ جینے کی امید نہیں اگر تم آ جاؤ تو یہیں ایک نگاہ دیکھ لوں۔ورنہ یہ حسرت بھی رہ جائے گی۔ میں کئی مہینے سے آگرے میں پڑی ہوں۔ اکیلے جی گھبرایا کرتا ہے۔ اگر کسی طرح سوامی جی کو لا سکو تو آخری وقت ان کی زیارت بھی کرلوں۔ میں جانتی ہوں وہ نہ آئیں گے۔مگر تم آنے میں ایک لمحہ بھی توقف نہ کرنا۔''

شنکھ دھر ڈاک خانہ کے سامنے کھڑا دیر تک روتا رہا۔

اس کا اترا ہوا منہ دیکھ کر چکر دھر نے پوچھا۔ ''کیوں بیٹا، آج کچھ اداس معلوم ہوتے ہو۔''

شنکھ دھر نے آنکھوں سے آنسو بھر کر کہا۔ ''آج ماتا جی کا خط آیا ہے۔وہ بہت بیمار ہیں۔ میں پتا جی کی تلاش میں نکلا تھا وہ تو نہ ملے۔اماں جی بھی رخصت ہوتی جاتی ہیں۔ آپ کے پاس بڑی بڑی امیدیں لے کر آیا تھا۔مگر آپ کو بھی ایک بے کس یتیم پر درد نہ آیا.....''

چکر دھر نے کانپتی آواز میں کہا۔ ''بیٹا میں تمہارے باپ کا پتہ لگا چکا ہوں۔ان سے مل بھی چکا ہوں۔وہ پوشیدہ طور پر تمہیں دیکھ بھی چکے ہیں۔''

شنکھ دھر: آپ کی پتا جی سے ملاقات ہوئی۔ پھر بھی آپ نے اس کا مجھ سے ذکر نہ کیا۔میں اسے اپنی بدنصیبی کے سوا اور کیا سمجھوں۔

چکر دھر نے کچھ جواب نہ دیا۔وہ سخت آزمائش میں پڑے ہوئے تھے۔ بہت دنوں کے بعد ناگہانی طور پر اپنے بیٹے سے ملنے کا اتفاق ہو گیا تھا۔وہ ساری آرزوئیں اور خواہشیں جنہیں وہ دل سے نکال چکے تھے پیدا ہو گئی تھیں۔اس وقت صدمۂ فراق سے زار و قطار رو رہے تھے۔نفس کا وہ پھندہ جسے انہوں نے بڑی مشکلوں سے چھڑایا تھا۔ ہر لمحہ

سخت ہوتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

یکا یک شنکھ دھر نے روندھے ہوئے گلے سے کہا۔ ''تو میں مایوس ہو جاؤں؟''

چکر دھر نے دل سے نکلنے والی آہ سرد کو دباتے ہوئے کہا۔ ''نہیں بیٹا ممکن ہے کبھی وہ خود تمہاری محبت سے بے قرار ہو کر خود تمہارے پاس دوڑے آئیں۔ اس کا فیصلہ خود تمہارے اطوار پر مبنی ہے۔''

شنکھ دھر: آپ کے درشن مجھے پھر کب ملیں گے؟ یہ کیسے معلوم ہو گا کہ آپ کہاں ہیں۔ اگر چہ مجھے والد بزرگوار سے نیاز حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن شفقت پدری کا جو تخیل میرے دل میں پیدا ہوا تھا، وہ آپ کی قدم بوسی نے پورا کر دیا۔ میں نے آپ کو اسی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اور ہمیشہ دیکھتا رہوں گا۔ یہ شفقت، یہ دست گیری، یہ نظر کرم مجھے کبھی نہ بھولے گی۔ ماتا جی کے صحت یاب ہوتے ہی میں پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔

چکر دھر نے رقت آمیز لہجہ میں کہا۔ ''نہیں بیٹا تمہیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود کبھی تم سے مل جایا کروں گا۔ میری دعا ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گی۔''

شام کے وقت شنکھ دھر اپنے باپ سے رخصت ہوئے۔ انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا ان کا دل سینے سے نکل کر شنکھ دھر کے ساتھ چلا جا رہا ہے۔ جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو انہوں نے ایک لمبی سانس لی اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ انہیں ایسا معلوم ہوا کہ زندگی تاریک ہو گئی۔ یس

بدنصیب اہلیا کے لیے سنسار سونا ہو گیا۔ شوہر کو پہلے ہی کھو چکی تھی۔ زندگی کا سہارا ایک لڑکا تھا۔ اسے بھی کھو بیٹھی۔ اب وہ کس کا منہ دیکھ کر جیے۔ وہ راج اس کے لیے کسی فقیر کی بد دعا ہو گئی۔

اہلیا کو وہ قصر شاہی اب پھاڑے کھاتا ہے۔ وہ اسے چھوڑ کر کہیں نکل بھاگنا چاہتی تھی۔ کوئی گلا سڑا جھونپڑا، کسی درخت کا سایہ، کسی پہاڑ کا غار، کسی ندی کا کنارہ، کسی جنگل کا

دامن اس کے لیے اس محل سے کہیں زیادہ سکون بخش ہوتا۔ وہ دن کتنے مبارک تھے جب وہ اپنے سوامی کے ساتھ اپنے لخت جگر کو سینہ سے لگائے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتی تھی۔ کیا وہ دن پھر نہ آئیں گے؟

وہ دیوان شاہی اب بھوتوں کا ڈیرہ ہو گیا ہے گویا اس کا نگراں نہیں رہا۔ راجہ صاحب مہینوں نہیں آتے۔ وہ بیشتر علاقہ ہی میں گھومتے رہتے ہیں۔ ان کے مظالم کی داستانیں سن کر لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ساری ریاست میں طوفان سا برپا ہے۔ کہیں کسی موضع میں آگ لگائی جاتی ہے۔ کہیں کسی گاؤں کے کنویں ناپاک کیے جاتے ہیں۔ راجہ صاحب کو کسی پر رحم نہیں آتا۔ اگر دست غیب نے ان کے گھر میں آگ لگائی ہے، تو وہ بھی دوسروں کے گھر میں آگ لگائیں گے۔

اب راجہ صاحب کے پاس جانے کا کسی کو حوصلہ نہیں ہوتا۔ منورما کو دیکھ کر تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اہلیا بھی ان کے سامنے زبان کھولتے ہوئے تھر تھر کانپتی ہے۔ اپنے پیاروں کی تلاش کے لیے وہ طرح طرح کے منصوبے باندھا کرتی ہے۔ مگر کہے کس سے؟ اب اسے بار بار خیال آتا ہے کہ اگر وہ ثروت کی ہوس میں شوہر سے بے اعتنائی نہ کرتی تو اس کی یہ حالت نہ ہوتی۔ وہ سوچتی ہے اگر میں اپنے گھر چلی جاؤں تو شاید ایشور میری خطا معاف کر دیں۔ اس کا ڈوبتا ہوا دل اس تنکے کے سہارے کو زوروں سے پکڑے ہوئے ہے، لیکن ہائے رے نفس۔ اس عذاب میں غرور کا جنون سر پر سوار ہے۔ جانا چاہتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ کوئی بلائے۔ اگر راجہ صاحب منشی جی سے اشارہ کر دیں تو فوراً بلاوا آ جائے، لیکن راجہ صاحب سے کچھ کہنے کا موقع نہیں ملتا یا ہمت نہیں ہوتی۔

اس میں شک نہیں کہ وہ منورما سے یہ راز کہہ دیتی تو منشا پوری ہو جاتی، لیکن منورما سے اس کا دل پہلے کبھی ملا تھا نہ اب ملتا تھا۔ اس سے یہ بات کیسے کہتی۔

ایک دن اہلیا کا دل اتنا بے قرار ہوا کہ وہ شرم اور خودداری کو بالائے طاق رکھ کر منورما کے پاس آ بیٹھی۔ منورما کے سامنے سائل کی صورت میں آنے میں اسے جو روحانی خلش

ہوئی اس کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ اپنے کمرہ سے یہاں تک آنے میں اسے آدھ گھنٹہ لگ گیا۔ کتنی ہی بار دروازہ تک آ کر لوٹ گئی۔ جس سے ہمیشہ بدظن رہی۔ اس کے سامنے اپنی غرض لے کر جانے میں اس کی موت ہوئی جاتی تھی، لیکن جب بھگوان نے ہی اس کے غرور کو پامال کر دیا تو اب جھوٹی اینٹھ سے کیا ہو سکتا تھا۔

اہلیا نے کہا۔ ''میں اس وقت آپ سے ایک درخواست کرنے آئی ہوں۔ مجھے ایسا گمان ہو رہا ہے کہ یہ ساری گردش میری ہوس ثروت کا پھل ہے۔ جب تک ثروت سے میرا گلا نہ چھوٹے گا مجھے اس عذاب سے نجات نہ ہوگی۔ میرا دل کہتا ہے یہاں سے نکل کر میری مرادیں پوری ہوں گی۔ آپ اتنی تکلیف کریں کہ اماں جی سے

کہہ دیں مجھے بلالیں۔''

منورما نے کہا۔ ''اچھا اچھا میں آج ہی جاتی ہوں۔''

منورما کو اہلیا سے آج سچی ہمدردی ہوئی۔ کون جانے اہلیا کے دل میں یہ غیبی تحریک ہو۔ اس نے اسی دن جا کر نرملا سے ذکر کیا اور دوسرے ہی دن منشی بجردھر نے راجہ صاحب کے پاس رخصتی کا پیغام بھیجا۔ راجہ صاحب علاقہ پر تھے۔ پیغام پاتے ہی جگدیش پور آئے۔ اہلیا کا کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا کہ کہیں راجہ صاحب سے سامنا نہ ہو جائے۔ ادھر ادھر بچتی پھرتی تھی۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ راجہ صاحب نے رخصتی منظور کر لی ہے۔ پر اب نہ جانے کیوں وہ جانے کے لیے بے تاب نہ تھی۔

یہاں سے جانا تو چاہتی تھی پر جانے کا صدمہ تھا۔ وہ اس گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگی تھی۔ سسرال اس کے لیے پرایا گھر تھا۔ کہیں نرملا نے کوئی ایسی بات کہہ دی تو وہ کیا کرے گی۔ جس گھر سے روٹھ کر نکلی تھی۔ مجبور ہو کر پھر وہیں جانا پڑ رہا تھا۔ ان خیالات نے اسے اتنا سراسیمہ کیا کہ آخر وہ راجہ صاحب کو جا کر بولی۔

''آپ مجھے کیوں رخصت کرتے ہیں۔ میں نہیں جانا چاہتی۔''

راجہ صاحب نے ہنس کر کہا۔ ''کوئی لڑکی ایسی بھی ہے جو خوشی سے سسرال جاتی ہو اور

کون باپ ایسا ہے جو لڑکی کو خوشی سے رخصت کرتا ہو۔ میں کب چاہتا ہوں کہ تم جاؤ، لیکن منشی بجر دھر کا حکم ہے اور اس کی تعمیل مجھ پر فرض ہے۔ وہ لڑکے کے باپ ہیں۔ میں لڑکی کا باپ ہوں۔ میری اور ان کی کیا برابری اور بیٹی میرے دل میں بھی ارمان ہیں۔ انہیں پورا کرنے کا اور کون موقع آئے گا۔ شنکھ دھر ہوتا تو اس کی شادی میں یہ ارمان پورے ہوتے۔ تمہارے گونے میں پورے ہوں گے۔''

اہلیا اس کا کیا جواب دیتی۔

دوسرے دن سے راجہ صاحب نے رخصتی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ سارے علاقے کے سنار پکڑ بلائے گئے اور زیور بننے لگے۔ علاقہ ہی کے درزی کپڑے سینے لگے۔ گھر کی صفائی سفیدی اور رنگائی ہونے لگی۔ راجاؤں، رئیسوں اور افسروں کے نام نوید بھیجے جانے لگے۔ سارے شہر کے طائفوں کے بیعانے دیئے گئے۔ برقی روشنی کا وسیع پیمانے پر انتظام کیا گیا۔ اہلیا یہ اہتمام دیکھ کر دل میں شرماتی اور جھنجھلاتی ہے۔ سوچتی کہاں میں نے رخصتی کا نام لیا۔ اب اس بڑھاپے میں میرا گونا ہو رہا ہے۔ میں مرنے کی راہ دیکھ رہی ہوں اور یہاں رخصتی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

راجہ بشال سنگھ نے جس اہتمام سے اہلیا کی رخصتی کی وہ راجاؤں، رئیسوں میں بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ تحصیلدار صاحب کے گھر میں ان چیزوں کے رکھنے کی جگہ بھی نہ تھی۔ باوجودیکہ تحصیلدار صاحب نے نیا مکان بنوایا تھا، مگر وہ کیا جانتے تھے کہ ایک دن ریاست جگدیش پور کی آدھی ثروت آ پہنچے گی۔ گھر کا کونہ کونہ سامان سے بھرا ہوا تھا۔ کئی پڑوسیوں کے مکان بھی اٹ اٹھے۔ اس پر لاکھوں روپے نقد ملے وہ الگ۔ تحصیلدار لانے کو تو سب لائے، پر انہیں دیکھ دیکھ کر روتے اور کڑھتے تھے۔ کوئی بھوگنے والا نہیں۔ دن میں بیسیوں بار چکر دھر پر بگڑتے۔ نالائق آپ تو گیا اپنے ساتھ لڑکے کو بھی لے گیا۔ نہ جانے کہاں مارا مارا پھرتا ہوگا۔ قوم کی خدمت کرنے چلا ہے۔ سچ کہا ہے، گھر کی راتیں بن کی ہوئیں، گھر کے آدمی مریں، پرواہ نہیں۔ دوسروں کے لیے جان دینے کے لیے تیار۔ اب بتاؤ۔

ہاتھی گھوڑے موٹروں اور گاڑیوں کو لے کر کیا کروں۔ اکیلے کس کس پر بیٹھوں۔ بہو ہے اسے رونے سے فرصت نہیں۔ ماں ہے زندہ درگور ہے۔ یہ سامان میرے جی کا جنجال ہو گیا۔

اہلیا یہاں آ کر اور بھی پچھتانے لگی۔ وہ تو اس کے تکلفات سے آزردہ خاطر ہو کر یہاں آئی تھی، پر وہ مصیبت اس کے ساتھ یہاں بھی آئی۔ سامان عیش سے گلا چھڑانا چاہتی تھی، پر وہ سامان اس کے ساتھ یہاں بھی آ گیا۔ وہاں وہ کچھ دیر اطمینان سے بیٹھ سکتی تھی۔ کچھ دیر ہنس بول سکتی تھی۔ کسی کے طعنے تشنے نہ سننے پڑتے تھے۔ یہاں ایک لمحہ کے لیے بھی سکون نہ تھا۔ نرملا اس کے زخم پر نمک چھڑکتی رہتی تھی۔ بہو کے کارن وہ اپنے بیٹے سے محروم ہوئی۔ بہو کے ہی کارن پوتا بھی ہاتھ سے گیا۔ ایسی سبز قدم بہو کو وہ اپنے گھر کی دیوی نہ سمجھ سکتی تھی۔ اس کی دولت لے کر وہ کیا کرے۔ چاہے کھانا بھی وہ اپنے ہاتھوں ہی پکاتی۔ اہلیا کے ساتھ جو مہراجنیں آئی تھیں ان کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا اس کے لیے چھوت تھا۔ ان دنوں منگلا بھی آئی ہوئی تھی۔ اس کا جی چاہتا یہاں کی ساری چیزیں سمیٹ کر لے جاؤں۔ اہلیا اپنی چیزوں کا لٹتا نہ دیکھ سکتی تھی۔ اس لیے نند بھاوج میں کبھی کبھی بدمزگی ہو جاتی تھی۔

اس طرح کئی مہینے گزر گئے اور اہلیا کا چراغ دن بدن مدھم ہوتا گیا۔ وہ کتنا چاہتی تھی کہ خواہشوں کی بندش سے اپنے کو چھڑا لوں، پر دل پر کوئی قابو نہ چلتا۔ اس کے دل میں بیٹھا ہوا کوئی بار بار کہتا تھا۔ جب تک موہ میں پڑی رہو گی شوہر اور بیٹے سے ملاقات نہ ہو گی، پر یہ یقین کون دلاسکتا تھا کہ موہ کے ٹوٹتے ہی اس کی مراد پوری ہو جائے گی۔ تب وہ کیا بھکارن بن کر زندگی کے دن کاٹے گی۔ دولت کے ہاتھ نکل جانے پر اس کے لیے پھر کون سا ذریعہ باقی رہ جائے گا۔

اہلیا بار بار عہد کرتی کہ اب سارے کام اپنے ہاتھوں کروں گی۔ ایک ہی وقت کھانا کھالوں گی، لیکن وہ کسی عہد پر قائم نہ رہ سکی۔ اس میں اصول پروری کی صلاحیت باقی نہ

تھی۔صاف تجربہ ہوگیا کہ یہاں رہ کر کچھ نہ کرسکیں گی۔

اب اسے باگیشوری کی یاد آئی۔سکھ کے دن وہی تھے جو اس کے ساتھ کٹے۔اصلی میکہ نہ ہونے پر بھی زندگی کا جو کچھ مزا وہاں ملا وہ پھر نہ نصیب ہوا۔آہ وہ دن خواب ہو گئے۔ساس ملی وہ اس طرح کی۔نند ملی وہ اس قماش کی۔ماں تھی ہی نہیں۔صرف ایک باپ ملے مگر کتنا مہنگا سودا تھا۔

اب اہلیا کو شب و روز یہی دھن رہتی تھی کہ کسی طرح باگیشوری کے پاس پہنچوں، گویا وہاں جاتے ہی اس کے سب دکھ دور ہو جائیں گے۔

آخر ایک دن اہلیا نے نرملا سے یہ چرچا کر ہی دیا۔نرملا نے کچھ بھی اعتراض نہ کیا۔شاید وہ خوش ہوگی کہ یہ کسی طرح یہاں سے ٹلے۔منگلا تو اس کے جانے کی تجویز سن کر خوش ہوئی کہ جب یہ چلی جائے گی تو گھر میں اس کا راج ہوگا۔جو چیز چاہے گی اٹھالے جائے گی۔کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہ ہوگا۔

دوسرے دن اہلیا وہاں سے چلی۔اپنے ساتھ کوئی سازوسامان نہ لیا۔صرف ایک بڈھے کہار کو پہچانے کے لیے لے لیا اور اسے بھی آگرے پہنچنے کے دوسرے دن رخصت کر دیا۔

آج بیس سال کے بعد اہلیا نے اس گھر میں قدم رکھا تھا۔سارا گھر منہدم ہوگیا تھا۔نہ آنگن کا پتہ تھا نہ دیوان خانے کا۔چاروں طرف ملبے کے ڈھیر جمع ہو رہے تھے۔اس پر مدار اور دھتورے کے پودے اگے ہوئے تھے۔ایک چھوٹی سی کوٹھری بچی رہی تھی۔باگیشوری اسی میں رہتی تھی۔اس کی صورت بھی اس گھر کی طرح تبدیل ہوگئی تھی۔نہ منہ میں دانت، نہ آنکھوں میں بصارت، کمر جھک کر کمان ہوگئی تھی۔دونوں گلے مل کر خوب روئیں۔جب آنسو تھمے تو باگیشوری نے کہا۔''بیٹی تم اپنے ساتھ سامان نہیں لائیں کیا۔دوسری گاڑی سے لوٹ جانے کا ارادہ ہے۔اتنے دنوں بعد آئیں بھی تو اس طرح۔ہاں اس کھنڈر میں تمہارا جی کیوں لگے گا؟''

اہلیا: ''اماں محلوں سے بہت بیزار ہوگئی۔ اب کچھ دن اس کھنڈر ہی میں رہوں گی اور تمہاری خدمت کروں گی۔ جب سے یہاں سے گئی ایک دن بھی سکھ نہیں پایا۔''

باگیشوری: لڑکے کا کچھ پتہ چلا؟

اہلیا: کسی کا پتہ نہیں چلا اماں۔ میں راج کے سکھوں پر شوہر سے گئی تھی۔ اس کا خمیازہ بھگت رہی ہوں۔ ان تکلفات سے جو کچھ ملتا ہے وہ دیکھ چکی۔ اب انہیں چھوڑ کر دیکھوں، مگر تمہیں تو بڑی تکلیف ہو رہی ہے اماں۔

باگیشوری: کیسی تکلیف بیٹی۔ جب تک تمہارے دادا جیتے رہے ان کی خدمت کرنے میں بھی مجھے عیش و راحت تھی۔ تیرتھ، برت، پن، دھرم سب کچھ ان کی خدمت ہی تھا۔ اب وہ نہیں رہے تو ان کے نام کی خدمت کر رہی ہوں۔ آج بھی ان کے کتنے ہی دوست میری مدد کو تیار ہیں، لیکن کیوں کسی کی مدد لوں؟ تمہارے دادا ہمیشہ دوسروں کی مدد کرتے تھے۔ اسی میں اپنی عمر کاٹ دی تو پھر میں کس منہ سے مدد کے لیے ہاتھ پھیلاؤں۔

یہ کہتے کہتے اس دیوی کا زرد چہرہ غرور سے چمک اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک رقت آمیز زندہ دلی نمودار ہوگئی۔ اہلیا کا سر شرم سے جھک گیا۔

باگیشوری نے پھر کہا۔ ''خواجہ محمود نے بہت چاہا کہ میں ان سے کوئی رقم ماہوار لے لیا کروں۔ میرے میکے والے بھی کئی بار مجھے بلانے آئے۔ میں نے کسی کا احسان نہیں لیا۔ شوہر کی کمائی چھوڑ کر اور کسی کی کمائی پر عورت کا اختیار نہیں ہوتا۔ جب تک آنکھیں تھیں سلائی کرتی رہی۔ جب سے آنکھیں گئیں دلائی کرتی ہوں۔ کبھی کبھی ان پر جی جھنجھلاتا ہے۔ جو کچھ مایا اڑا دیا، لیکن پھر دل کو سمجھاتی ہوں کہ انہوں نے کسی برے کام میں تو نہیں اڑایا جو کچھ کیا اپنے بھائیوں کی بھلائی کے لیے تو کیا۔ یہاں تک کہ اپنی جان بھی دے دی۔ پھر میں کیوں پچھتاؤں اور کیوں روؤں۔ چلو ہاتھ منہ دھو ڈالو۔ کچھ کھا پی لو تو پھر باتیں کریں گے۔''

اہلیا ہاتھ منہ دھونے کے لیے اٹھی۔ باگیشوری کی وہ عصمت پروری دیکھ کر اس کا نفس

اس پر ہنس رہا تھا۔ ایک یہ ہیں کہ شوہر کے نام پر اپنے کو مٹائے دیتی ہیں ایک تو ہے کہ ثروت دیکھ کر اندھی ہوگئی۔

باگیشوری نے پھر کہا۔ ''ابھی تک تو بیٹھی ہے۔ ہاں لونڈی پانی نہیں لائی کیسے اٹھے گی۔ لے میں لائے دیتی ہوں۔ ہاتھ منہ دھو ڈال۔ تب تک میں تیرے لیے گرم روٹیاں سیکتی ہوں۔''

اہلیا یہ اخلاص میں ڈوبے ہوئے الفاظ سن کر باغ باغ ہوگئی۔ جو اس 'تو' میں مزا تھا وہ 'آپ' و 'سرکار' میں نہ تھا۔ بچپن کے دن آنکھوں میں پھر گئے۔ بولی۔ ''ابھی تو بھوک پیاس نہیں ہے۔ اماں جی، بیٹھیے کچھ باتیں کیجیے۔ میں اپنی مصیبت کی داستان کہنے کے لیے بےقرار ہو رہی تھی۔ بتائیے میرا بیڑا کیسے پار ہوگا۔''

باگیشوری نے بزرگانہ متانت سے کہا۔ ''جس کے لیے تو نے شوہر اور بیٹے کو کھویا۔ اسے چھوڑ کر ہی تو اپنے پیاروں کو پائے گی۔ تجھے اتنی ہوس کیسے ہوگئی؟ میری سمجھ میں نہیں آتا۔''

اہلیا: اماں سچ کہتی ہوں میں محض شنکھ دھر کا خیال کر کے ان کے ساتھ نہ گئی۔

باگیشوری: اس خیال میں کیا تیری نفس پرستی پوشیدہ نہ تھی۔ تو اس سے انکار نہیں کر سکتی۔

اہلیا نے شرمندہ ہو کر کہا۔ ''ہو سکتا ہے اماں جی میں انکار نہیں کر سکتی۔''

باگیشوری: وہ ہوس یہاں بھی تجھے نہ چھوڑے گی۔ دیکھ لینا۔ جو اس سے بھاگتا ہے اسی کے پیچھے وہ دوڑتی ہے ایک بار تو چوکی تو چودہ برس رونا پڑا۔ اب کے چوکی تو باقی عمر روتے ہی گزر جائے گی۔

اہلیا کے آنے کی خبر پا کر محلے کی سینکڑوں عورتیں ٹوٹ پڑیں۔ شہر کے کئی بڑے گھروں کی عورتیں آ پہنچیں۔ شام تک تانتا لگا رہا۔ کچھ لوگ وفد بنا کر چندہ مانگنے آئے۔ اہلیا کو ان سے جان بچانا مشکل ہوگیا۔ کس کس سے اپنی مصیبت کی داستان کہے۔ اپنی

غرض باولے اپنی کہتے ہیں۔ کسی کی سننے کی انہیں کہاں فرصت۔ اس وقت اہلیا کو بے سرو سامانی سے یہاں آنے پر بڑی شرم آئی۔ اگر جانتی کہ یہاں یہ ہنگامہ ہوگا تو وہ اپنے ساتھ دس بیس ہزار کے نوٹ لیتی آتی۔ اسے اب اس ٹوٹے پھوٹے مکان میں ٹھہرتے بھی شرم آتی تھی۔ جب سے اسے راجکماری کا رتبہ حاصل ہوا وہ شہر سے باہر نہ گئی تھی۔ کبھی کاشی رہتی کبھی جگدیش پور۔ اب اسے معلوم ہوا کہ دولت محض تن پروری کی چیز نہیں۔ اس سے شہرت اور نیک نامی بھی مل سکتی ہے۔ تن پروری سے تو اسے نفرت ہوگئی تھی، لیکن نیک نامی کا شہرہ پہلی ہی بار ملا۔ شام تک اس نے پندرہ بیس ہزار کے چندے لکھ دیئے اور منشی بجر دھر سے روپیہ بھیجنے کی بھی التجا کی۔ خط لکھنے کی دیر تھی۔ روپے فوراً آ گئے۔ پھر تو اس کے دروازہ پر فقیروں کا جمگھٹ رہنے لگا۔ لنگڑے اندھوں سے لے کر جوڑی اور موٹر پر بیٹھنے والے گداگر آ آ کر دست سوال پھیلانے لگے۔

اہلیا کو اب روز ہی کسی نہ کسی جلسہ میں جانا پڑتا تھا اور وہ بڑے شوق سے جاتی تھی دو ہی ہفتوں میں اس کی کایا پلٹ کی سی ہوگئی۔ حرص ہوس کا جادو سر چڑھنے لگا۔ فی الواقع ان مصروفیات میں وہ اپنی مصیبتیں بھول گئی۔ اچھی تقریریں تیار کرنے میں اسے اتنا انہماک رہنے لگا۔ گویا نشہ ہوگیا ہے اور یہ تھا بھی نشہ ہی۔ حرص شہرت سے بڑھ کر دوسرا نشہ نہیں۔

باگیشوری پرانے خیالات کی۔ اسے اہلیا کا یوں گھوم گھوم کر تقریریں کرنا اور روپے لٹانا اچھا نہ لگتا تھا۔ ایک دن اس نے کہہ ہی ڈالا۔ ''کیوں ری اہلیا۔ تو اپنی ساری دولت لٹا کر رہے گی۔''

اہلیا نے پرغرور انداز سے کہا۔ ''دولت ہے ہی کس لیے اماں۔ دولت میں اتنی برائی ہے کہ اس سے تکلف کا شوق بڑھتا ہے۔ لیکن اس سے ثواب بھی تو ہوسکتا ہے۔''

باگیشوری نے ثواب کے نام سے چڑ کر کہا۔ ''تو جو کر رہی ہے۔ ثواب نہیں ہے۔ ناموری کی ہوس ہے۔''

دوسرے دن ڈاکیا شنکھ دھر کا خط لے کر پہنچا جو جگدیش پور رہوتا ہوا آیا تھا۔ اہلیا خط

پڑھتے ہی اچھل پڑی اور دوڑی ہوئی باگیشوری کے پاس جا کر بولی۔ ''اماں! دیکھو للو کا خط آ گیا۔ دونوں آدمی ایک ہی جگہ ہیں۔ للو نے ان کا پتہ لگا ہی لیا۔ مجھے بلا رہا ہے۔''

باگیشوری: تو بس تو چلی ہی جا۔ چل میں بھی تیرے ساتھ چلوں گی۔

اہلیا: آج پورے پانچ سال کے بعد للو کا خط آیا ہے۔ مجھے آگرہ آنا پھل گیا۔ یہ تمہاری دعا کا اثر ہے۔

باگیشوری: میں تو اس لڑکے کے جیوٹ کو سراہتی ہوں کہ باپ کا پتہ لگا کر ہی دم لیا۔

اہلیا: اس خوشی میں آج ہی آج جشن ہونا چاہیے۔

باگیشوری: جشن پیچھے منانا، پہلے وہاں چلنے کی تیاری کرو۔

سارا دن گزر گیا، لیکن اہلیا نے سفر کی کوئی تیاری نہ کی۔ وہ سفر کے لیے اب کچھ آمادہ نظر نہ آتی تھی۔ مسرت کا پہلا جوش ختم ہوتے ہی وہ اب اس دبدھا میں پڑ گئی کہ وہاں جاؤں یا نہ جاؤں۔ وہاں جانا محض دس پانچ دن یا مہینہ دو مہینہ کے لیے جانا نہ تھا۔ بلکہ راج پاٹ سے ہاتھ دھو لینا اور شنکھ دھر کی تقدیر کو پلٹنا تھا۔ وہ جانتی تھی باپ کا پجاری شنکھ دھر انہیں چھوڑ کر کسی طرح نہ آئے گا اور میں بھی ممتا کے جال میں پھنس جاؤں گی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ شنکھ دھر کو کسی حیلہ سے بلا لینا چاہیے۔ اس کا دل کہتا تھا کہ شنکھ دھر آ گیا تو اس کا باپ بھی ضرور آئے گا۔ اس وقت وہاں جا کر وہ اپنے بیٹے کی آرزوؤں کا خون نہ کرنا چاہتی تھی۔ جیسے اتنے دنوں ان کے فراق میں جلی ہے، اسی طرح کچھ دن اور جلے گی۔ یہ فیصلہ کر کے اس نے شنکھ دھر کو خط لکھا، میں بہت بیمار ہوں بچنے کی امید نہیں۔ بس ایک بار تمہیں دیکھنے کی آرزو ہے۔ تم آ جاؤ تو شاید جی اٹھوں۔ اگر نہ آئے تو سمجھ لینا اماں مر گئی۔ اہلیا کو یقین تھا کہ شنکھ دھر پڑھ کر دوڑا چلا آئے گا۔

شام کے وقت باگیشوری نے پوچھا۔ ''کیا جانے کا ارادہ نہیں ہے۔''

اہلیا نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تو اماں میں نے للو کو بلایا ہے۔ اگر وہ نہ آیا تو چلی جاؤں گی۔''

باگیشوری: للو کے ساتھ کیا چکر دھر بھی آ جائیں گے؟ تو ایسا موقع پا کر چھوڑ دیتی ہے۔ نہ جانے ابھی تیری گردش کے کتنے دن باقی ہیں۔

اہلیا اپنے سارے دکھ بھول کر شنکھ دھر کی گدی نشینی کے منصوبے باندھ رہی تھی۔

چوبیس

راجہ بشال سنگھ کا ذوق مردم آزاری روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ جیوں جیوں انہیں اپنی اصلی حالت زار پر رنج ہوتا، ان کے ظلم وستم بڑھتے تھے، ان کے دل میں اب ہمدردی رحم یا صبر کے لیے ذرا بھی جگہ نہ تھی۔ ادھر کچھ دنوں سے انہوں نے غیبی حملوں کا جواب دینے کے لیے ایک نیا اسلحہ تیار کیا تھا۔ انہیں اولاد سے محروم رکھ کر ان کی اولاد کو گود سے چھین کر مشیت نے ان پر سب سے بڑا ظلم کیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں انہیں پامال کرنے کے لیے سب سے بڑی چوٹ یہی تھی۔ اسے راجہ صاحب اس کے ہاتھوں سے چھین لینا چاہتے تھے۔ انہوں نے پانچویں شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ راجاؤں کے لیے کنیاؤں کی کیا کمی۔ کئی مہینوں سے اس شادی کی تیاری ہو رہی تھی۔ کئی راج وید رات دن بیٹھے قسم قسم کے کشتہ جات اور مقوی ادویات تیار کرتے رہتے تھے۔ راجہ صاحب یہ شادی اتنی دھوم دھام سے کرنا چاہتے تھے کہ دیوتاؤں کے کلیجہ پر سانپ لوٹنے لگے۔

رانی منورما نے ادھر کئی مہینوں سے ریاست کے معاملات میں دخل دینا چھوڑ دیا تھا۔ وہ بولتی بھی تو سنتا کون؟ کہاں تو یہ حال تھا کہ راجہ صاحب کو اس کے بغیر کوئی لمحہ بھی چین نہ آتا تھا۔ وہی منورما اب دودھ کی مکھی کی طرح نکال دی گئی۔ اس کا جی تو چاہتا کہ ایک بار راجہ صاحب سے جا کر پوچھے کہ مجھ سے کیا خطا ہوگئی۔ مگر راجہ صاحب اسے اس کا موقع نہ دیتے تھے۔

منورما کو آئے دن کوئی نہ کوئی ذلت برداشت کرنی پڑتی تھی، لیکن وہ صبر وتوکل کا اتھاہ ساگر ہے، جس میں ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے کوئی تلاطم نہیں ہوتا۔ وہ مسکرا کر ہر ایک وار کے آگے سر جھکا دیتی ہے۔ اس تبسم میں کتنا درد، آفات کو حقیر سمجھنے کی

کتنی طاقت بھری ہوئی ہے۔نئی رانی صاحبہ کے لیے نیا محل بنوایا جا رہا ہے۔اس کی سجاوٹ کے لیے ایک بڑے آئینہ کی ضرورت تھی۔حکم ہوا چھوٹی رانی کے دیوان خانہ کا بڑا آئینہ اتار لاؤ۔منورما نے یہ حکم سنا تو مسکرا دی۔پھر قالین کی ضرورت پڑی ۔پھر وہی حکم ہوا۔منورما نے مسکرا کر ساری قالینیں دے دیں۔اس کے کچھ دنوں بعد حکم ہوا چھوٹی رانی کی موٹر نئے محل میں لائی جائے۔منورما اس موٹر کو بہت پسند کرتی تھی اور اسے خود چلاتی تھی،یہ حکم سن کر مسکرا دی۔

منورما کے پاس بہت سی لونڈیاں تھیں۔ادھر گھٹتے گھٹتے ان کی تعداد تین تک پہنچ گئی۔ایک دن حکم ہوا ان میں سے دو لونڈیاں نئے محل میں تعینات کی جائیں۔اس کے ایک ہفتہ بعد وہ بھی بلا لی گئی۔اس حکم کا بھی مسکرا کر اس نے خیر مقدم کیا۔

مگر ابھی سب کاری چوٹ باقی تھی۔نئی رانی کے لیے محل تو بن رہا تھا۔ان کی والدہ کے لیے ایک دوسرے مکان کی ضرورت تھی۔راجہ صاحب نے نئے محل میں اس کا قیام مناسب نہ سمجھا۔اس لیے حکم ہوا چھوٹی رانی کا محل خالی کرا لیا جائے۔رانی نے یہ حکم سنا تو مسکرا دی۔جس حصے میں پہلے مہریاں رہتے تھیں۔اسی کو اس نے اپنا مسکن بنا لیا۔وہاں بھی اتنی ہی خوش تھی۔

رات بھیگ چکی تھی۔باہر برات کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ایسا شاندار جلوس نکالنے کا انتظام ہو رہا تھا جیسا اس شہر میں کبھی نہ نکلا ہو۔گوری فوج تھی۔کالی فوج تھی۔ریاست کی فوج تھی۔فوجی بینڈ تھا۔ریاست کا بینڈ تھا۔کوتل گھوڑوں کی قطار ۔سجے ہوئے ہاتھیوں کیا یک پوری لائن۔پھولوں سے سجائی ہوئی سواری گاڑیاں۔خوبصورت جھانکیاں۔اتنا سامان تھا کہ شام سے ہر رات تک تانتا ہی نہ ٹوٹا۔صد ہا تخت سجائے گئے اور پھلواریوں کی تو کوئی گنتی ہی نہ تھی۔ساری رات دروازہ پر چہل پہل رہی۔راجہ صاحب آرائش کے انتظام میں منہمک رہے۔

سارے شہر میں اس جلوس اور شادی کا مضحکہ اڑایا جا رہا تھا۔ نوکر چاکر تک آپس میں ہنستے تھے۔ راجہ صاحب کی چٹکیاں لیتے تھے، لیکن اپنی دھن میں مست راجہ صاحب کو کچھ نہ سنائی دیتا تھا۔

چار بجتے بجتے برات نکلی۔ طرح طرح کے باجے بج رہے تھے۔ روپے لٹائے جا رہے تھے۔ قدم قدم پر پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔ شہر تماشا دیکھنے کو پھٹا پڑتا تھا۔

اسی وقت اہلیا اور شنکھ دھر شہر میں داخل ہوئے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ راجہ بشال سنگھ کی بارات ہے تو انہوں نے راجہ صاحب کو اپنے آنے کی اطلاع دی۔ دم کے دم میں ساری برات رک گئی۔ کنور صاحب آ گئے۔ یہ خبر ہوا کے جھونکے کی طرح اس سرے سے اس سرے تک دوڑ گئی۔ جو جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ راجہ صاحب نے شنکھ دھر کو دیکھتے ہی گھوڑے سے کود کر اسے سینہ سے لگا لیا۔ وہ آرزو پوری ہو گئی جس کے نام کو رو چکے تھے۔ بار بار کنور کو چھاتی سے لگاتے تھے۔ پر آسودگی نہ ہوتی تھی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ جب ذرا طبیعت کو سکون ہوا۔ بولے تم آ گئے بیٹا۔ مجھ پر بڑی دیا کی۔ اپنے باپ کو بھی لائے ہو کیا؟''

شنکھ دھر نے کہا۔ ''وہ تو نہیں آئے۔''

راجہ صاحب: ''آئیں گے۔ میرا دل کہتا ہے۔ میں تو زندگی سے بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ تم چلے گئے تمہاری ماں بھی چلی گئی۔ پھر میں کس کا منہ دیکھ کر جیتا۔''

شنکھ دھر۔ ''اماں تو میرے ساتھ ہیں۔''

راجہ صاحب۔ ''اچھا وہ بھی آ گئی۔ واہ میرے ایشور، ساری خوشیاں ایک ہی دن کے لیے جمع کر رکھی تھیں۔'' دونوں اسی وقت اہلیا کے پاس آئے۔ باپ اور بیٹی کی ملاقات کا نظارہ نہایت مسرت انگیز تھا۔ جب آنسوؤں کا سیلاب کچھ کم ہوا تو راجہ صاحب بولے ''تمہیں یہ برات دیکھ کر ہنسی آئی ہو گی۔ سبھی ہنس رہے ہیں لیکن بیٹا یہ

برات نہیں۔کیسی برات اور کیسا دولہا؟ یہ ایک مجنوں دل کی تڑپ ہے اور کچھ نہیں دل کہتا تھا جب ایشور کو میری پرواہ نہیں، وہ مجھ پر ذرا بھی رحم نہیں کرتے، بے سبب مجھے ستاتے ہیں تو میں کیوں اس کا احترام کروں۔ جب آقا کو خادم کی فکر نہیں تو خادم آقا کی کیوں فکر کرے۔ میں نے خوب پیٹ بھر ظلم کیے۔ حق اور ناحق، روا اور ناروا کے سارے خیالات دل سے نکال دیئے اور آخر میں میری اس پر فتح ہوئی۔

منشی بجر دھر نے یہ مژدہ سنا تو گھوڑے پر سوار ہوئے اور قصر شاہی میں آ پہنچے شنکھ دھر ان کے آنے کی خبر پا کر ننگے پاؤں دوڑا اور ان کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ منشی جی نے پوتے کو چھاتی سے لگا لیا اور بولے۔ ''یہ مبارک دن دیکھنا بدا تھا۔ اسی لیے اب تک زندہ ہوں۔ اب اتنی آرزو ہے کہ تمہارا راج تلک دیکھ لوں۔ تمہاری دادی بیٹھی تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔ کیا انہیں بھول گئے؟ شنکھ دھر نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''جی نہیں شام کو جانے کا ارادہ تھا۔ انہی کی دعا سے تو میں منزل مقصود پر پہنچا۔''

منشی جی نے پوچھا۔ ''تم للو کو اپنے ساتھ نہ گھسیٹ لائے۔''

شنکھ دھر: ''

آپ ہی کہیں گے''

اب یہ کیا کرنے آیا ہے۔ شاید کچھ لینے کی غرض سے آئے ہوں گے۔ زندگی میں صاحب ثروت نہیں رہا لیکن اپنے وقار کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔''

راجہ صاحب: آخر آپ دن بھر بیٹھے وہاں کیا کرتے ہیں؟ دل بھی نہیں گھبراتا؟

منشی جی: ''اب تو راج کمار کا تلک ہو جانا چاہیئے۔ آپ بھی کچھ دن بھگوت بھجن کر لیجئے۔''

راجہ صاحب: ''خیال تو میرا بھی یہی ہے لیکن نہ جانے کیا بات ہے؟ کہ جب سے شنکھ دھر آیا ہے۔ مجھے نہ جانے کیوں یہ وہم ہوتا ہے کہ اس تقریب میں کوئی نہ کوئی خلل واقع ہوگا۔ دل کو بہت سمجھاتا ہوں لیکن یہ اندیشہ دل سے دور نہیں ہوتا۔''

منشی جی: ''آپ ایشور کا نام لے کر تلک کیجئے جب ٹوٹی ہوئی آرزوئیں پوری ہوگئیں تب سارے کام خیر وخوبی سے ہو جائیں گے۔ آج میرے یہاں محفل ہوگی۔ آپ کو بھی دعوت دیتا ہوں۔''

راجہ صاحب: ''نہیں منشی جی۔ مجھے تو معاف کیجئے۔ میرے دل کو سکون نہیں ہے۔ آپ سے سچ کہتا ہوں آج اگر مجھے موت آجائے تو مجھ سے زیادہ خوش نصیب آدمی دنیا میں نہ ہوگا۔ غم کی انتہا دیکھ لی خوشی کی انتہا بھی دیکھ لی۔ اب کچھ دیکھنے کی ہوس نہیں۔ ڈرتا ہوں کہیں پلڑا دوسری طرف نہ جھک پڑے۔''

منشی جی دیر تک بیٹھے راجہ صاحب کو تشفی دیتے رہے۔ پھر سب عورتوں کو اپنے یہاں آنے کا نیوتہ دے کر اور شنکھ دھر کو گلے لگا کر وہ گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ اس بے لوث آدمی نے فکروں کو کبھی اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیا دولت کی خواہش تھی۔ ثروت کی بھی خواہش تھی۔ اس پر جان نہ دیتے تھے۔ جمع کرنا تو سیکھا ہی نہ تھا۔ تھوڑا ملا تب بھی تنگی رہی۔ بہت ملا تب بھی تنگی رہی۔ تنگی سے آخر دم تک ان کا گلا نہ چھوٹا۔ ایک زمانہ تھا جب اچھت کھانے کو ترستے تھے۔ اب دل کھول کر خیرات کرنے کو ترستے تھے۔ کیا پاؤں کیا دے دوں۔ بس فکر تھی تو اتنی ہی۔ کمر جھک گئی۔ آنکھوں سے سوجھتا بھی کم تھا، لیکن محفل روزانہ جمتی تھی۔ دل میں کسی سے کینہ نہیں رکھا اور نہ کبھی کسی سے بدخواہ ہوئے۔

دوسرے دن منشی جی کے گھر بڑی دھوم دھام سے جشن ہوا۔ نرملا پوتے کو چھاتی سے لگا کر خوب روئی۔ اس کا جی چاہتا تھا یہ میرے گھر رہے۔ اسے دیکھنے سے آنکھوں کو سیری نہ ہوتی تھی۔ اہلیا ہی کے باعث اس کا لڑکا ہاتھ سے گیا۔ پوتا بھی اس کے کارن ہاتھ سے جا رہا ہے۔ اس لیے اب بھی اس کا دل اہلیا سے نہ ملتا تھا۔ وہ اب اس آخر وقت میں کسی کو آنکھوں کے اوٹ نہ کرنا چاہتی تھی۔ نہ جانے کب

آنکھیں بند ہو جائیں۔ بے چاری کسی کو دیکھ بھی نہ سکے۔

باہر گانا ہو رہا تھا۔ منشی جی دعوت کا انتظام کر رہے تھے۔ اہلیا لالٹین لے کر گھر کے اثاثہ کا جائزہ لے رہی تھی اور دل میں اپنی چیزوں کے تہس نہس ہو جانے پر جھنجھلا رہی تھی۔ ادھر نرملا چارپائی پر لیٹی شنکھ دھر کی باتیں سننے میں محو تھی۔

علی الصبح جب شنکھ دھر رخصت ہونے لگا نرملا نے کہا۔ ''بیٹا اب بہت دن نہ جیوں گی۔ جب تک جیتی ہوں۔ ایک بار ضرور آ جایا کرو۔''

آج راجہ صاحب کے یہاں بھی تقریب تھی۔ اس لیے شنکھ دھر نہ ٹھہر سکا۔ عورتیں بھی نرملا کے پاؤں چھو کر رخصت ہو گئیں تو شنکھ دھر نہ ٹھہر سکا۔ عورتیں بھی نرملا کے پاؤں چھو کر رخصت ہو گئیں تو شنکھ دھر کھڑے ہوئے نرملا نے کہا۔ میں تمہاری راہ دیکھتی رہوں گی۔ شنکھ دھر آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوئے جب وہ موٹر پر بیٹھ گئے تو نرملا دروازے پر کھڑی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ شنکھ دھر کے ساتھ اس کا دل بھی اڑا چلا جا رہا تھا۔ جوانوں محبت میں اضطراب ہوتا ہے اور بوڑھوں کی محبت میں درد۔ جوان جس سے محبت کرتا ہے اس سے محبت کی امید رکھتا ہے۔ اگر اس سے محبت کے بدلے محبت نہ ملے تو محبت کو دل سے نکال کر پھینک دے گا۔ بوڑھوں کو بھی کیا یہی امید ہوتی ہے؟ وہ محبت کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اس کے بدلے میں انہیں کچھ نہ کچھ ملے گا یا ملے گا تو رحم۔ شنکھ دھر کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ دل میں تڑپ نہ تھی۔ وہ یوں خوش خوش چلا جا رہا تھا جیسے سیر کر کے لوٹا ہو۔

مگر نرملا کا دل پھٹا جا رہا تھا اور منشی بجر دھر کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔

پچیس

کئی دن گزر گئے۔ راجا صاحب عبادت اور پرستش میں مصروف تھے۔ ادھر پانچ

سال سے انہوں نے کسی مندر کی طرف جھانکا نہ تھا۔ ریاست میں دھرم کا کھاتہ ہی توڑ دیا گیا۔ مگر اب یکا یک ان کا اعتقاد جی اٹھا تھا۔ دھرم کھاتہ پھر کھولا گیا اور جو اوقاف بند کر دی گئی تھیں وہ پھر جاری ہوئیں۔ راجہ صاحب نے پھر چولا بدلا۔ شنکھ دھر کے لوٹتے ہی ان کی پوجا پاٹھ کی آنکھ کھلی اور دان پن کی انہیں دھن ہوئی۔

ان دنوں راجہ صاحب اکثر تنہائی میں بیٹھے کسی فکر میں غرق رہتے تھے۔ باہر بہت کم نکلتے۔ کسی چیز سے رغبت نہ رہی تھی۔ اب اپنی زندگی کے کارنامے یاد کر کے ان کی تلافی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی، رنواس میں سوتا پڑا ہوا تھا۔ منورما اپنی چھوٹی کوٹھری میں پڑی ہوئی تھی۔ دفعتاً راجہ صاحب اندر داخل ہوئے، منورما حیرت میں آ کھڑی ہوگئی۔

راجہ صاحب کو کوٹھری کو نیچے سے اوپر تک دیکھ کر رقت آمیز لہجہ میں بولے:

''نورا! میں آج تم سے اپنی خطائیں معاف کرانے آیا ہوں میں نے تمہارے ساتھ بڑی بے انصافی کی ہے۔ مجھے معاف کر دو۔''

منورما نے چشم پر آب ہو کر کہا۔ ''ان باتوں کو یاد نہ کیجیے۔ آپ کو بھی رنج ہوتا ہے اور مجھے بھی رنج ہوتا ہے۔ میرا ایشور جانتا ہے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی میرے دل میں بے وفائی کا خیال نہیں آیا۔''

راجہ صاحب: ''جانتا ہوں نورا جانتا ہوں، آج معلوم ہو رہا ہے۔ کہ مصیبت میں دل کے نازک جذبات فنا ہو جاتے ہیں، ثروت پا کر جو کچھ مجھے کرنا چاہیئے تھا۔ وہ کچھ نہ کر سکا۔ سچ تو یہ ہے کہ نورا میری زندگی ہی ناکام ہوگئی۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ مجھے یہ ریاست نہ ملی ہوتی۔ تو میری زندگی اس سے کہیں اچھی ہوتی۔ مجھے بھی اکثر یہی خیال ہوتا ہے۔''

راجہ صاحب: ''اب زندگی کے سب سے اونچے زینے پر پہنچ کر جب گزرے

ہوئے زمانے پر نظر ڈالتا ہوں تو افسوس ہوتا ہے کہ مجھ سے کسی کو فیض نہ پہنچا۔ میں زندگی کی ان برکتوں سے بھی محروم رہا جو عوام کے حصے میں آتی ہیں۔ شنکھ دھر اپنے ساتھ میرے دل کی ساتی نزاکتوں کو بھی لے گیا تھا۔ اسے پا کر آج پھر میں اپنے کو پا گیا ہوں، لیکن میرا دل اندر ہی اندر کانپ رہا ہے۔ میں اس خوف کو کسی طرح باہر نہیں نکال سکتا کہ کوئی آفت آنے والی ہے۔''

یہ کہتے کہتے راجہ صاحب منورما اور قریب چلے آئے اور ان کے کان کے پاس منہ لے کر جا کر بولے۔ ''یہ خوف بالکل بے بنیاد نہیں ہے نورا۔ رانی دیوپریا کے شوہر میرے بھائی تھے۔ ان کی صورت شنکھ دھر سے بالکل ملتی ہے۔ جوانی میں میں نے انہیں دیکھا۔ ہو بہو یہی صورت تھی۔ ان کی ایک تصویر میرے البم میں ہے۔ تم یہی کہو گی کہ یہ شنکھ دھر کی تصویر ہے۔ پہلے شنکھ دھر کی صورت ان سے اتنی ملتی تھی جتنی میری۔ اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود ہی آ گئے۔''

منورما: ''تو اس میں خوف کی کیا بات ہے اسی شاخ کا پھل شنکھ دھر بھی ہے۔''

راجہ صاحب: ''نہیں نورا، تم یہ بات نہیں سمجھ رہی ہو تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ یہ پراسرار معاملہ ہے۔ میں نے اب کی شنکھ دھر کو دیکھا تو چونک پڑا اس وقت میرے روئیں کھڑے ہو گئے۔''

منورما نے اس مرتبہ پورے یقین سے کہا۔ ''آپ کو خوف بے بنیاد ہے۔'' راجہ صاحب نے زانو پر ہاتھ مار کر کہا۔ ''نور تم اب بھی نہیں سمجھیں۔ خیر کل سے تم نئے محل میں رہو گی۔ یہ میرا حکم ہے۔''

راجہ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ بجلی کی شفاف روشنی میں منورما ان کی ہٹتی ہوئی صورت کو کھڑی دیکھتی رہی۔ غرور سے اس کا دل پھولا نہ سماتا تھا۔ اس بات کا غرور نہ تھا کہ اب ریاست میں پھر اس کا طوطی بولے گا۔ اسے پھر سیاہ سفید کا اختیار ہو گا۔ غرور اس بات کا تھا کہ وہ امتحان میں پوری اتری۔ آج بشال سنگھ نے منورما کے دل

پر فتح پائی ان کی رواروی نے منورما کو جیت لیا۔

راجہ صاحب کو اب کسی طرح اطمینان نہ تھا۔ ایک نا معلوم دہشت ان پر ہمیشہ غالب رہتی۔ دو چار آدمیوں کو زور زور سے باتیں کرتے سنتے انہیں کسی حادثہ کا گمان ہو جاتا۔ شنکھ دھر کہیں جاتا تو جب تک وہ خیریت سے لوٹ نہ آئے انہیں اضطراب رہتا تھا۔ وہ کبھی کبھی راتوں کو اٹھ کر ٹھاکر دوارے میں چلے جاتے اور گھنٹوں ایشور کی استتی کرتے۔ شنکھ دھر کا چہرہ دیکھتے ہی ان کی آنکھیں پر آب ہو جاتی تھیں۔ جو خوف ان کے دل میں تھا وہ ظاہر نہ کر سکتے تھے شاید اس کی حقیقت سے بے خبر تھے۔

شام ہو گئی تھی۔ راجہ صاحب نے موٹر منگوائی اور منشی بجر دھر کے مکان پر جا پہنچے۔ منشی جی کی مجلی آراستہ تھی۔ ان کی ساری فکریں ساری پریشانیاں نغمہ کی تانوں میں روپوش ہو جاتی تھیں۔ راجہ کو دیکھتے ہی بولے۔ آیئے مہاراج! آج آپ کو گوالیار کے ایک استاد کا گانا سناؤں۔ یہ اس زمانہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔''

راجہ صاحب دل میں منشی جی کی رنگین مزاجی پر جھنجھلائے۔ دنیا میں ایسی مخلوق بھی ہے جنہیں اپنے عیش کے سامنے کسی چیز کی پروا نہیں سنکھ دھر سے میرا ان کا یکساں تعلق ہے۔ مگر یہ اپنے گانے بجانے میں مست ہیں اور میں تفکرات کا شکار ہوں۔ بولے۔ اس لیے تو آیا ہوں کن آپ سے تخلیہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

دونوں آدمی ایک الگ کمرے میں آ بیٹھے۔ راجہ صاحب سوچنے لگے کس طرح بات چیت شروع کروں۔ منشی جی نے ان کا رخ دیکھ کر کہا۔ ''میرے لائق جو خدمت ہو۔ فرمایئے۔ آپ متفکر معلوم ہوتے ہیں۔''

راجہ صاحب: ''یہ تو بہت دنوں سے جانتا تھا۔ مگر اس سے دل کو اطمینان نہیں ہوتا اب مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ دنیا پرستی ہی ساری برائیوں کی جڑ ہے۔ میں نے اپنی زندگی پر کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی غور نہیں کیا زندگی کا مقصد کیا ہے۔ کبھی اس پر

دھیان ہی نہ دیا۔ جب راج نہ تھا تو کچھ دنوں کے لیے خدمت کا خیال دل میں پیدا ہوا تھا۔ راج ملتے ہی میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ شنکھ دھر کو پا کر میں نہال ہو گیا تھا۔ لیکن اب کی جب سے وہ لوٹا ہے اس کی طرف سے ایک عجیب فکر پیدا ہو گئی ہے۔۔ آپ نے میرے بھائی صاحب کو دیکھا تھا؟''

منشی جی: ''جی نہیں میں ان دنوں باہر نوکر تھا۔''

راجہ صاحب: ''بھائی صاحب کی صورت میری آنکھوں میں آج تک پھر رہی ہے۔ یہ دیکھیے ان کی تصویر ہے۔'' یہ کہہ کر راجہ صاحب نے ایک فوٹو نکال کر منشی جی اسے دیکھتے ہی بولے۔ ''یہ تو شنکھ دھر کی تصویر ہے۔''

راجہ صاحب: ''نہیں صاحب یہ میرے بڑے بھائی کی تصویر ہے۔ شنکھ دھر نے تو ابھی تک تو تصویر ہی نہیں کھینچوائی۔''

منشی جی: ''میں اسے کیسے مان لوں۔ یہ جو تصویر صاف شنکھ دھر کی ہے۔''

راجہ صاحب: ''تو تحقیق ہو گیا کہ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں۔''

منشی جی: ''یہ معمہ سمجھ میں نہیں آیا۔''

راجہ صاحب: ''اب آپ سے غرض کروں۔ دو صورتوں میں اتنی مشابہت میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ یہ فکر مجھے مارے ڈالتی ہے۔ بھائی صاحب نے ہی پھر میرے گھر میں اوتار لیا ہے۔ اس میں مجھے ذرا شبہ نہیں ایشور ہی جانے کیوں ایشور نے یہ عنایت کی ہے۔''

منشی جی: ''ایشور چاہیں گے تو سب خیریت ہو گی۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔''

راجہ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور چلتے چلتے تشویشناک لہجہ میں بولے۔ ''جو بات پوچھنے آیا تھا وہ تو بھول ہی گیا۔ آپ نے سادھو سنتوں کی بہت خدمت کی ہے

۔مرنے کے بعد ان کو کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہوتی ؟''

منشی جی: ''سنا تو یہی ہے کہ ہوتی ہے اور اس سے زیادہ ہوتی ہے جتنی قید حیات میں۔''

راجہ صاحب: ''جھوٹی بات ہے بالکل جھوٹی۔ یقین نہیں ہوتا۔ اس دنیا کے دکھ سکھ اور ہی قسم کے ہوں گے میں تو سمجھتا ہوں کسی بات کی یاد ہی نہ رہی ہوگی۔ میرے بعد جو کچھ ہونا ہے وہ تو ہوگا ہی۔ آپ سے اتنا ہی کہنا ہے کہ اہلیا کو تسلی دیتے رہیے گا۔ منورما کی طرف سے میں بے فکر ہوں۔ وہ ہر ایک حالت میں مستقبل رہ سکتی ہے اہلیا اس بجلی کی چوٹ کو نہ سہہ سکے گی۔''

منشی جی نے مضطرب ہو کر راجہ صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا اور با چشم تر بولے۔ آپ اتنے مایوس کیوں ہو رہے ہیں؟ ایشور پر توکل رکھیے سب خیریت ہوگی۔''

راجہ صاحب: ''کیا کروں میرا دل آپ کا سا نہیں ہے، شنکھ دھر کی صورت دیکھ کر میرا خون سرد ہو جاتا ہے۔ وہ میرا نواسا نہیں، دشمن ہے۔ اس سے کہیں اچھا ہو تا کہ میں بے اولاد ہوتا۔''

راجہ صاحب دروازہ کی طرف چلے منشی جی بھی ان کے ساتھ موٹر تک آئے۔ راجہ صاحب کے ان صبر شکن الفاظ نے ان کے حواس گم کر دیئے تھے۔ راجہ صاحب نے موٹر پر بیٹھ کر کہا۔ ''تکلیف نہ کیجئے میں نے جو التجا کی ہے اس کا خیال رکھیے گا۔

منشی جی صورت تصویر لیے کھڑے رہے۔ موٹر چلی گئی۔

راجہ بشال سنگھ دروازے پر آ کر کھڑے ہوئے تھے کہ اہلیا کے رونے کی آواز آئی۔

''ہائے بیٹا تم مجھے چھوڑ کر کہاں جاتے ہو۔ کیا اس لیے مجھے آگرے سے لائے تھے؟''

راجہ صاحب یہ صدائے درد سنتے ہی گویا ندی میں پھسل پڑے۔ ایک ہاتھ آنکھیں

پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی آنکھوں سے جو نہ دیکھنا چاہتے تھے وہی دیکھنا پڑ رہا تھا اور اتنا جلد۔ ابھی ہی وہ منشی بجر دھر کے پاس سے لوٹے تھے آہ کون جانتا تھا کہ قدرت اتنی جلد سب کچھ تباہ کر دے گی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کرتے مشیت نے ان کی خواہشوں کا خاتمہ کر دیا۔

راجہ صاحب نے کمرے میں جا کر شنکھ دھر کا چہرہ دیکھا۔ ان کی زندگی کا چراغ بجھا ہوا تھا۔ آج سے پچاس سال قبل انہوں نے آنکھوں سے یہی نظارہ دیکھا تھا۔ ان کی زبان سے ماتم کا ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ آنکھوں سے آنسو کی ایک بوند بھی نہ گری۔ کھڑے کھڑے زمین پر گر پڑے اور زندگی کا پردہ گر گیا۔

چھبیس

شنکھ دھر کے چلے آنے کے بعد چکر دھر کو یہ عالم ویران نظر آنے لگا۔ خدمت کا وہ جوش رخصت ہو گیا۔ اس خوش رو نوجوان کی صورت آنکھوں میں پھرا کرتی۔ کھانے کھانے بیٹھتا تو اس کی جگہ خالی دیکھ کر ان کے حلق میں لقمہ نہ جاتا۔ ہر وقت کچھ کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ بار بار یہی جی چاہتا کہ اس کے پاس چلا جاؤں۔ شنکھ دھر جس کمبل پر سوتا تھا اسے روز جھاڑ پونچھ کر رکھ دیتے ہیں گویا وہ آنے والا ہے۔ صرف چند دنوں کے لیے کہیں چلا گیا ہے۔ شنکھ دھر اپنی کھنجڑی چھوڑ گیا ہے۔ وہ بڑی حفاظت سے رکھی ہوئی ہے۔ کوئی اسے چھونے نہیں پاتا۔ یہاں تک کہ اس کے پرانے کرتے اور پھٹی ہوئی دھوتیاں بھی دھلا کر رکھ دی گئی ہیں۔

شام ہو گئی ہے۔ چکر دھر رخصت کی تیاری کر رہے ہیں۔ اب یہاں نہیں رہا جاتا۔ اس نوجوان کے دیدار کا اشتیاق اب روکے نہیں رکتا۔

رات کو انہیں ایک ہولناک خواب نظر آیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ شنکھ دھر ندی کے کنارے ان کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ دفعتاً دور سے ایک کشتی آتی ہوئی دکھائی دی۔

اس میں سے منا سنگھ تھا۔ اس نے ہنس کر کہا۔

''بابو جی۔۔۔۔۔ یہی راج کمار ہے نا؟ میں بہت دنوں سے انہیں تلاش کر رہا ہوں۔ راجہ صاحب انہیں بلا رہے ہیں۔''

شنکھ دھر اٹھ کر منا سنگھ کے ساتھ چلا۔ دونوں کشتی پر بیٹھے۔ منا سنگھ ڈانڈ چلانے لگا۔ چکر دھر کنارے کھڑے رہے۔ ناؤ تھوڑے ہی دور جا کر چکر کھانے لگی۔ شنکھ دھر نے دونوں ہاتھ اٹھا کر انہیں بلایا۔ وہ دوڑے پر اتنے میں کشتی ڈوب گئی۔ ایک لمحہ میں کشتی اوپر آ گئی۔ منا سنگھ سابق کی طرح ڈانڈ چلا رہا تھا مگر شنکھ دھر کا پتہ نہ تھا۔

چکر دھر زور سے چیخ مار کر جاگ اٹھے۔ ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔ ''ایشور یہ خواب ہے یا شدنی۔''

اسی وقت اٹھ بیٹھے۔ بقچہ اٹھایا اور چل کھڑے ہوئے۔

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ پہاڑیوں کی قطاریں گورغریباں کی طرح سنسان تھیں۔ چکر دھر قدم بڑھاتے ہوئے پتھے یلی پگ ڈنڈیوں پر چلے جا رہے تھے۔ ان کی حالت وہ تھی جب اپنے کو اپنی خبر نہیں ہوتی۔ وہ ساری رات پتھریلے راستے پر چلتے رہے۔ صبح سویرے ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ گاڑی آیہ اس پر جا بیٹھے۔ گاڑی میں کون لوگ بیٹھے تھے۔ چکر دھر کو دیکھ کر وہ آپس میں کیا بناتن کر رہے تھے۔ ان سے کیسے کیسے سوال کر رہے تھے۔ ان سوالوں کا وہ کیا جواب دیتے تھے۔ راستہ میں کون کون اسٹیشن ملے۔ کب دوپہر ہوئی۔ کب شام ہوئی۔ ان کیفیات کی انہیں بالکل خبر نہ تھی۔ مگر وہ کر وہی رہے تھے جو کرنا چاہئے۔ کسی بات کا الٹا پلٹا جواب نہ دیتے۔ جن گاڑیوں پر نہ بیٹھنا چاہتے ان پر نہ بیٹھے۔ جن اسٹیشنوں پر نہ اترنا چاہئے۔ وہاں نہ اترتے۔ عادت اکثر ہوش قائم مقام ہو جایا کرتی ہے۔

تیسرے دن سویرے گاڑی کاشی پہنچی۔ جیوں ہی گاڑی گنگا کے پل پر پہنچی چکر دھر

جیسے ہوش میں آ گئے۔ سنبھل بیٹھے۔ گنگا کے بائیں کنارے ہریالی چھائی ہوئی تھی۔ دوسری طرف کاچی کی سر بفلک عمارتیں، مندروں کے کلس اور مسجدوں کے مینار نستعلیق تحریر کی طرح اپنی موزوں پستی و بلندی کے شفق صبح میں منقوش تھے۔ وسط میں گنگا کا حاشیہ تھا۔ آفتاب کی گلکاریوں سے مرصع۔ آج بہت دنوں کے بعد یہ دلآویز منظر دیکھ کر چکر دھر کے دل میں عقیدت کا ایک دریا موجزن ہو گیا۔ ایک لمحہ کے لیے وہ اپنے سارے تفکرات بھول گئے۔

اسٹیشن پر کئی پرانے احباب سے ملاقات ہو گئی۔ ان کی صورتیں کتنی تبدیل ہو گئی تھیں۔ وہ شکر دھر کو دیکھ کر چونکے۔ خیریت پوچھی اور چلے گئے۔ چکر دھر نے دل میں کہا۔ کتنے روکھے لوگ ہیں۔ کسی کو دو چار باتیں کرنے کی فرصت نہیں۔

دشاسمیدھ گھاٹ پر وہ ٹانگے سے اترے۔ اس گھاٹ پر وہ پہلے بھی اشنان کیا کرتے تھے۔ سبھی پنڈے انہیں جانتے تھے۔ پر آج کسی نے بھی خندہ پیشانی سے ان کا خیر مقدم نہ کیا۔ کسی نے نہ پوچھا۔ کہاں کہاں کی سیر کی۔

اتنے دن کہاں پھرتے رہے۔

اشنان کر کے وہ پھر ٹانگے پر آ بیٹھے اور راج محل کی طرف چلے۔ جوں جوں محل قریب آتا تھا۔ ان کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ تانگہ صدر دروازہ پر پہنچا۔ وہ ریاست کا جھنڈا جو سر اونچا کیے لہراتا تھا جھکا ہوا تھا۔

تانگہ دیکھتے ہی بوڑھا دربان آ کر کھڑا ہو گیا۔ چکر دھر کو غور سے دیکھ کر پہچانا اور اندر کی طرف بھاگا۔ ایک لمحہ محل میں کہرام مچ گیا۔ کسی سے پوچھیں۔ کیا قیامت برپا ہوئی۔ کوئی قریب نہیں آتا سب کے سب دور سر جھکائے کھڑے ہیں وہ کون لاٹھی ٹیکتا چلا آتا ہے۔ ارے یہ تو منشی بجر دھر ہیں۔ چکر دھر تانگے سے اتر کر ان کے قدموں پر گر پڑے۔

منشی بجرد ھر نے ملامت آمیز لہجہ میں کہا۔ ''دو چار دن پہلے نہ آتے بنا کہ لڑکے کا منہ دیکھ لیتے۔ اب آتے ہو جب ستیاناس ہو گیا۔ کیا بیٹھے بیٹھے یہی منا رہے تھے؟''

چکر دھر روئے نہیں۔ سنجیدہ مگر مستقل انداز سے بولے۔ ''ایشور کی مرضی میں کسی کو کیا دخل۔ مجھے کسی نے ایک خط بھی تو نہ لکھا۔ بیماری کیا تھی؟''

منشی جی: ''اجی بیماری! سر میں درد تک نہ ہوا۔ بس ہونہار تقدیر۔ رات کو کھانا کھا کر بیٹھے۔ کوئی کتاب دیکھ رہے تھے کہ جنت کی راہ ملی۔ جو سنتا ہے دانتوں میں انگلی دبا کر رہ جاتا ہے۔ بے چارے راجہ صاحب بھی اسی غم میں چل بسے۔ تم نے لڑکے کو بھلا دیا۔ پر اسے مرتے دم تک تمہارے نام کی رٹ لگی ہوئی تھی۔ ہم اور تم کیا روئیں گے۔ روتی ہے رعایا۔ اتنے دنوں میں ساری ریاست اس پر جان دینے لگی تھی۔ اس دنیا میں کوئی کیا رہے۔ جی سیر ہو گیا۔ اب تو جب تک جینا ہے رونا ہے۔ ایشور کو الزام نہ دیجیے۔''

منشی جی: ''تم نے ایسے اعمال کیے ہوں گے۔ میں نے نہیں کیے۔ مجھے کیوں اتنی بڑی چوٹ لگائی؟ میں ابھی تک ایشور کو منصف اور رحیم سمجھتا تھا لیکن اب اعتقاد نہیں رہا۔ بھجن کرتے ساری عمر ہو گئی اس کا یہ حاصل۔ اس پر کہتے ہو ایشور کو الزام نہ دیجیے۔ ایسے ظالم کے گن کون گائے اور کیوں گائے؟ بھلے آدمی کھڑے تاک رہے ہو۔ تمہاری آنکھوں سے آنسو کیوں نہیں نکلتے۔ میں کہتا ہوں رو لو نہیں تو کلیجہ میں ناسور پڑ جائے گا۔ بڑے بڑے تیاگی دیکھے ہیں لیکن جو پیٹ بھر کر رویا نہیں اسے پھر ہنستے نہیں دیکھا آؤ اندر چلو۔ بہو نے دیوار سے سر پٹک دیا۔ پٹی باندھے پڑی ہے۔ تمہیں دیکھ کر شاید اسے کچھ تسکین ہو۔''

یہ کہتے ہوئے منشی جی نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور محل میں لے گئے۔ اہلیا کو ان کے آنے کی خبر مل گئی تھی۔ اٹھنا چاہتی تھی پر اٹھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔

چکر دھر نے سامنے آ کر کہا ''اہلیا۔''

اہلیا نے لیٹے لیٹے شوہر کی جانب دیکھا کتنی حسرت تھی۔ کتنا شکوہ کتنی یاس اور کتنی ندامت ۔ چکر دھر رو پڑے ۔ اہلیا نے دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ اور پھر آنکھیں بند ہو گئیں۔

☆ اسی وقت منورما آ گئی۔ چکر دھر نے آنسوؤں کو روک کر کہا۔ رانی جی ۔ ذرا آ کر انہیں چارپائی سے اتروا دیجئے۔

☆ منورما نے اندر آ کر اہلیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ بس آپ ہی کا انتظار تھا ورنہ جان تو کب کی نکل چکی تھی۔ ہائے دکھیا کی کوئی بھی آرزو پوری نہ ہوئی۔''

یہ کہتے کہتے منورما کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

تتمہ

کئی سال گزر گئے۔ منشی بجر دھر اب قید حیات میں نہیں ہیں۔ گھوڑے کی سواری کا انہیں بے حد شوق تھا۔ نر گھوڑے پر ہی سوار ہوتے تھے۔ بگھی، موٹر، پالکی کو وہ زنانہ سواری کہتے تھے۔ ایک دن جگدیش پور سے بہت رات گئے لوٹ رہے تھے۔ راستہ میں ایک نالہ پڑتا تھا۔ نالے میں اترنے کے لیے راستہ بھی بنا ہوا تھا لیکن منشی جی اتر کر اسے پار کرنا شان جوانمردی کے خلاف سمجھتے تھے۔ گھوڑے کو جست کر ادیا۔ گھوڑے نے جست لگائی۔ اس پار نکل گیا پر اس کے پاؤں ایک گڑھے میں جا پڑے۔ گھوڑا گر گیا۔ منشی جی بھی گرے اور پھر نہ اٹھے۔ ہنس کھیل کر زندگی کاٹ دی۔ نرملا بھی اس صدمہ کو نہ سہہ سکی۔ اس کی آخری خواہش کہ چکر دھر پھر شادی کر لیں نا تمام رہ گئی۔

رانی منورما اب نئے محل میں رہتی ہیں۔ انہوں نے کتنی ہی چڑیاں پال رکھی ہیں۔ انہیں کی نگرانی اور پرورش میں اب وہ زندگی کے دن کاٹ رہی ہیں۔ طیور کے نغموں میں اپنی خلش ہائے باطن کو دبا دینا چاہتی ہیں۔

چکر دھر بہت دنوں گھر پر نہ رہے۔ ماں باپ کی وفات کے بعد وہ گھر گھر ہی نہ رہا۔ پھر دکھن کی راہ لی، لیکن اب وہ صرف عوام کی خدمت نہیں کرتے۔ انہیں طیور سے خاص شغف ہو گئی ہے۔ عجیب وغریب طائروں کی انہیں ہمیشہ تلاش رہتی ہے۔ ان کی چڑیوں کا ایک چڑیا گھر ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا ہے۔

شام ہو گئی تھی۔ منورما باغ میں ٹہل رہی تھی۔ دفعتاً حوض کے پاس ایک خوبصورت پنجرا نظر آیا۔ اس میں ایک پیاری مینا بیٹھی ہوئی تھی۔ منورما کو تعجب ہوا۔ یہ پنجرا یہاں کیسے آیا۔ ایسی خوبصورت چڑیا اس کے پاس ایک بھی نا تھی۔ وہ قریب گئی تو مینا بولی۔

''نورا! ہمیں بھول گئیں تمہارا پرانا خادم ہوں۔''

منورما کے استعجاب کی انتہا نہ رہی۔ اسے کچھ خوف ہوا۔ اسے میرا نام کس نے پڑھایا؟ کس کی چڑیا ہے؟ یہاں کیسے ہوئی؟ اس کا مالک ضرور یہیں ہوگا۔ آتا ہوگا۔ دیکھوں کون ہے۔

وہ بڑی دیر تک کھڑی اس آدمی کا انتظار کرتی رہی۔ جب کوئی نہ آیا۔ تو اس نے مالی کو بلا کر پوچھا۔

''یہ پنجرا باغ میں کون لایا؟''

مالی نے کہا۔ ''پچھا نتا نہیں سرکار، پر ہیں کوئی بھلے مانس۔ مجھ سے دیر تک ریاست کی باتیں پوچھتے رہے پنجرا رکھ کر گئے کہ ایک چڑیا اور لیتا آؤں۔ پر لوٹ۔

''آج پھر آویں گے؟''

''ہاں سرکار کہہ تو گئے ہیں۔''

''آئیں تو مجھے خبر دینا۔ صورت کیسی ہے۔ بتا سکتا ہے''

''لمبا قد ہے۔ لمبا منہ۔ دبلے دبلے سے ہیں۔ آنکھیں بڑی بڑی ہیں۔''

منورما نے اشتیاق سے کہا۔

''آئیں تو مجھے ضرور بلا لینا، سمجھا؟''

وہ پنجرا لے کر چلی گئی۔ رات بھر وہ مینا اس کی آنکھوں میں پھرتی رہی۔ وہی جملہ کانوں میں گونجتا رہا۔

سہ پہر کو منورما اپنے بالاخانہ پر جا کر ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔ وہاں سے مالی کا مکان اور باغ صاف نظر آتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے بڑی دیر ہوگئی۔ اندھیرا ہونے لگا رانی نے ٹھنڈی سانس لی۔ شاید اب وہ نہ آئیں گے۔

یکا یک اس نے دیکھا۔ ایک آدمی دو پنجرے دونو ہاتھوں میں لٹکائے باغ میں آیا

۔منورما کا دل بانسوں اچھلنے لگا۔اس نے سوچا۔مالی مجھے بلانے آئے گا۔مگر مالی نہ آیا اور وہ آدمی پنجرے رکھ کر چلا گیا۔منورما اب وہاں کھڑی نہ رہ سکی۔

ہائے ہائے وہ چلے جا رہے ہیں۔اس کے آنکھوں میں آنسو بہنے لگے۔

مالی نے آ کر کہا سرکار وہی آدمی دو پنجرے رکھ گیا ہے۔اور کہہ گیا ہے پھر کبھی اور چڑیاں لاؤں گا۔

منورما نے غضبناک ہو کر پوچھا۔تو نے اسی وقت مجھے کیوں اطلاع نہیں دی؟

مالی پنجرے زمین پر رکھتا ہوا بولا سرکار میں تبھی آ رہا تھا۔پر اس آدمی نے منع کیا۔کہنے لگا۔ابھی انہیں کیوں بلاؤ گے۔میں بھی کبھی آ کر ان سے مل لوں گا۔

رانی کچھ نہ بولی اور پنجرے میں بند چڑیوں کو پراشک آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

اختتام